من بروز آرم شبِ افکارِ شرق
بر فروزم سینۂ احرارِ شرق اقبالؔ

روحِ مشرق

علامہ اقبالؒ کی معرکۃ الآرا فارسی تصنیف "پیامِ مشرق" کا
اُردو زبان میں منظوم اور مکمل ترجمہ

اثرِ خامہ

عبدالرحمٰن طارقؔ

ناشر
ملک دین محمد اینڈ سنز اشاعت منزل بُل روڈ لاہور

نقشِ اوّل — فروری ۱۹۵۲ء

قیمت — ۳ روپے ۸ آنے

ناشر
ملک محمد عارف

مطبع
دین محمدی پ، لاہور

ز جانِ بے قرار آتش کُشادم
دِلے در سینۂ مشرق نہادم
گِلِ او شعلہ زار از نالۂ من
چو برق اندر نہادِ اُو فتادم

اقبال

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

اِنتساب

میں اِس کتاب کو ہر اُس محترم مسلمان کے نام سے
منسوب کرتا ہوں جس نے کلامِ اقبالؒ کے تعمیری و اِصلاحی
عناصر کو عملی جامہ پہنانے کے بعد دیگر افرادِ ملّت میں بھی
اس کی زیادہ سے زیادہ نشر و اشاعت کی ہے۔

طارق

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

فہرستِ مطالب

نمبر شمار	نظم	صفحہ	نمبر شمار	نظم	صفحہ
۱	پیش لفظ	ر تا د	۱۹	کبر و ناز	۱۲۰
۲	دیباچہ	ہ تا	۲۰	لالہ	۱۲۱
۳	لالۂ طور (رباعیات)	۱۱ تا ۹۴	۲۱	حکمت و شعر	۱۲۲
	افکار		۲۲	کرمکِ شب تاب	۱۲۲
۴	پہلا پھول	۹۵	۲۳	حقیقت	۱۲۵
۵	دُعا	۹۶	۲۴	حُدی	۱۲۵
۶	ہلالِ عید	״	۲۵	قطرۂ آب	۱۳۰
۷	تسخیر فطرت	۹۷	۲۶	گفتگو مابینِ خُدا و انسان	۱۳۲
۸	بُوئے گُل	۱۰۱	۲۷	ساقی نامہ	۱۳۳
۹	نوائے وقت	۱۰۲	۲۸	شاہین و ماہی	۱۳۵
۱۰	فصلِ بہار	۱۰۴	۲۹	کرمکِ شب تاب	۱۳۶
۱۱	حیاتِ جاوید	۱۰۸	۳۰	تنہائی	۱۳۶
۱۲	افکارِ انجم	۱۰۹	۳۱	شبنم	۱۳۸
۱۳	زندگی	۱۱۰	۳۲	عشق	۱۴۲
۱۴	گفتگو مابین علم و عشق	۱۱۱	۳۳	ذوقِ خطر	۱۴۳
۱۵	سرودِ انجم	۱۱۲	۳۴	جہانِ عمل	۱۴۴
۱۶	نسیمِ صبح	۱۱۶	۳۵	زندگی	۱۴۵
۱۷	باز کی نصیحت اپنے بچّے کو	۱۱۷	۳۶	حکمتِ فرنگ	۱۴۶
۱۸	کرمِ کتابی	۱۱۹	۳۷	حُور و شاعر	۱۴۷
			۳۸	زندگی و عمل	۱۵۰

نمبر شمار	نظم	صفحہ	نمبر شمار	نظم	صفحہ
۳۹	الملک للہ	۱۵۰	۵۹	فلسفہ و سیاست	۲۳۵
۴۰	جوئے آب	۱۵۱	۶۰	صحبتِ رفتگاں	۲۳۶
۴۱	نامۂ عالمگیرؒ	۱۵۲	۶۱	نیٹشا	۲۳۸
۴۲	بہشت	۱۵۴	۶۲	حکیم آئن سٹائن	۲۳۹
۴۳	کشمیر	۱۵۵	۶۳	بائرن	۲۴۰
۴۴	عشق	۱۵۶	۶۴	نیٹشا	۲۴۱
۴۵	بندگی	۱۵۷	۶۵	جلال و ہیگل	۲۴۲
۴۶	غلامی	″	۶۶	پٹوفی	۲۴۳
۴۷	چیستانِ شمشیر	۱۵۸	۶۷	گفتگو مابین آگسٹس کومٹ و مردِ مزدور	۲۴۴
۴۸	جمہوریت	″	۶۸	ہیگل	۲۴۵
۴۹	بہ مبلغ اسلام در فرنگستان	۱۵۹	۶۹	جلال و گوئٹے	۲۴۶
۵۰	غنی کشمیری	۱۶۰	۷۰	پیغامِ برگساں	۲۴۷
۵۱	خطاب بہ مصطفٰے کمال پاشا	۱۶۱	۷۱	میخانۂ فرنگ	۲۴۸
۵۲	طیّارہ	۱۶۲	۷۲	موسیولینن و قیصر ولیم	۲۴۹
۵۳	عشق	۱۶۳	۷۳	حکما	۲۵۱
۵۴	تہذیب	۱۶۴	۷۴	شعرا	۲۵۲
۵۵	مئے باقی (غزلیات)	۱۶۷ تا ۲۲۲	۷۵	خراباتِ فرنگ	۲۵۳
	نقشِ فرنگ		۷۶	خطاب بہ انگلستان	۲۵۴
			۷۷	سرمایہ دار مزدور سے	۲۵۵
۵۶	پیام	۲۲۵	۷۸	نوائے مزدور	۲۵۷
۵۷	جمعیت الاقوام	۲۳۳	۷۹	آزادیِ بحر	۲۵۸
۵۸	شوپن ہار و نیٹشا		۸۰	خردہ	۲۵۹ تا ۲۶۴

پیش لفظ

(از جناب صاحبزادہ ابو نعیم عبدالحکیم صاحب نشتر جالندھری)

کسی تقریر یا تحریر کا ایک زبان سے دُوسری زبان میں ترجمہ کرنا بظاہر جس قدر آسان معلوم ہوتا ہے حقیقتاً اسی قدر مشکل ہے۔ کسی موضوع پر کوئی مضمون یا کتاب خود لکھ لینا ایک خاص قابلیت کا متقاضی ہے۔ لیکن کسی مضمون یا کتاب کو دُوسری زبان میں منتقل کرنے کے لئے ایک مابہ الامتیاز اور منفرد دسترس کی ضرورت ہے یہ راستہ بہت پُرپیچ، بہت پُرخار اور بہت سنگلاخ ہے۔ اس منزل کی ہمت گسل مشکلات کا صحیح اندازہ صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں، جو خود اس میں گام زن ہوئے ہوں۔ مجھے بھی بعض کرم فرماؤں کے پُر اصرار اور ناگزیر ارشادات کی تعمیل کے لئے فارسی اور انگریزی سے اُردو میں منثور و منظوم ترجمہ کرنے کا اتفاق ہُوا ہے۔ اس لئے میں اس کے موانع کی جزئیات تک سے بخوبی آگاہ ہوں ؂

ترجمہ کرنے کا ایک طریق تو یہ ہے۔ کہ الفاظ کی پروا کئے بغیر اصل عبارت کے صحیح مفہوم اور سچی رُوح کی ہو بہو تصویر اپنے الفاظ کے موقلم سے کھینچ دی جائے دُوسرا اسلوب یہ ہے۔ کہ ایک زبان کے الفاظ اور محاورات کو کلیتہً محفوظ رکھتے ہوئے انھیں کے مترادف الفاظ اور محاورات میں منتقل کر دیا جائے۔ اور اصلی رُوح بھی قائم رکھی جائے۔ میرے خیال میں مؤخر الذکر انداز بہتر اور مشکل تر ہے۔ اِس ضمن میں جب مَیں نے محترمی ملک محمّد عارف صاحب مالک ادارہ ملک دین محمّد اینڈ سنز اشاعت منزل بُل روڈ لاہور کے حسب ارشاد عزیز مکرّم عبدالرحمٰن صاحب طارق کی زیرِ نظر کتاب "رُوحِ مشرق" کو جو حضرت علّامہ اقبال رحؒ کی بلند پایہ تصنیف "پیامِ مشرق" کا منظوم اُردو ترجمہ ہے، تنقیدی اور اصلاحی نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ تو دیباچے میں جناب مترجم کے یہ الفاظ نظر آئے:۔

"قارئین اس ترجمے کو ایک تحت اللّفظ ترجمہ ہرگز تصوّر نہ فرمائیں یہاں مکھی پر مکّھی مار کر مطالب و معانی کو محض طلسمِ الفاظ پر قربان نہیں کیا گیا۔ یہ ایک "آزاد" ترجمہ ہے جس میں شاعر کے اصل مفہوم و مدّعا کو زیادہ سے زیادہ واضح اور بسیط صورت میں پیش کیا گیا ہے"۔

پھر "پیامِ مشرق" کو سامنے رکھ کر ایک ایک شعر کا مقابلہ کرتے ہوئے ترجمے پر ہر لحاظ سے غائر نظر ڈالی۔ واقعی طارق صاحب نے اپنی مذکورہ تحریر کے مطابق "آزاد" ترجمہ کرنے میں قابلِ قدر کوشش سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ کسی ایک زبان کی منثور یا منظوم کتاب کا دُوسری زبان میں منظوم ترجمہ کرنا میرے نزدیک مستحسن نہیں۔ کیونکہ نثر ہی میں ترجمے کا صحیح حق ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔ چہ جائیکہ اسے نظم کیا جائے۔ نظم کرتے وقت لازماً بحر و زمین کی پابندی کے باعث بعض زائد الفاظ تحریر کرنے اور اصلی الفاظ چھوڑنے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میں قرآن عزیز جیسی الہامی اور مقدس ترین کتاب کا منظوم اُردو ترجمہ کرنا غیر مستحسن ہی نہیں بلکہ گناہ سمجھتا ہوں۔ کیونکہ کتاب اللہ کا تقدس نظم کے حشو و زوائد کا متحمل نہیں۔ بہر نوع میں نے بہت زیادہ محنت و عرق ریزی اور بہت زیادہ وقت صرف کر کے "رُوحِ مشرق" پر نظرِ ثانی کی تو اس نتیجے پر پہنچا۔ کہ جناب طارق کی محنت اور ہمّت واقعی سزاوارِ ستائش ہے اب یہ کتاب اِس قابل ہو گئی ہے کہ اربابِ علم و نظر کے سامنے بے تکلف پیش کی جاسکے؛

اس مختصر پیش لفظ میں شرح و بسط سے کام لینے کی گنجائش نہیں۔ ورنہ

میں متعدد مثالیں پیش کر کے "رُوحِ مشرق" کی بعض رُوح پرور تجلّیوں سے قارئینِ کرام کے ذوقِ نظر کے لئے تسکین کا سامان بہم پہنچاتا، بہر حال خوانندگانِ محترم خود ہی مطالعے کے دوران میں اس کے محاسن کی جلوہ افشانیوں سے دامانِ نگاہ بھر لیں گے ؛

آخر میں دُعا ہے۔ کہ خداوندکریم جناب طارق کی اس ادبی خدمت کو حُسنِ قبول سے مزیّن کرے۔ اور ادبی دُنیا کی شایانِ شان قدردانی سے انھیں اس سلسلے میں مزید لائقِ تحسین خدمت کی توفیق ارزانی ہو ؛

دیباچہ

"پیامِ مشرق" جیسی ہنگامہ خیز اور معرکۃ الآرا رُوحانی واخلاقی تصنیف کی شانِ نزول کیا ہے؟ اِس کے متعلق علّامہ اقبال خود تحریر فرماتے ہیں :-

"پیامِ مشرق کی تصنیف کا محرّک جرمن حکیمِ حیات گوئٹے کا "مغربی دیوان" ہے، جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر ہائنا لکھتا ہے: "یہ ایک گلدستۂ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے۔ اِس دیوان سے اِس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد رُوحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے"۔

اِن تاثّرات سے یہ حقیقت ثابت ہے کہ شاعرِ مشرق نے "پیامِ مشرق" کی بنیاد اِسی احساس کے تحت رکھی تھی کہ مغرب کی "سرد روحانیت" کو مشرق کے

سینۂ گرم " سے کچھ پُر سوز نالے اور نغمے عطا کئے جائیں تاکہ وہ محض مادہ پرستی
سے اجتناب کر کے اپنی رُوحانی زندگی کی تجدید و اصلاح بھی کر سکے۔ علامہ اقبالؒ
کو یورپ کی اِس بڑھتی ہوئی رُوحانی تشنگی کا اندازہ یوں تو وہاں کے متعدد
صاحبِ بصیرت مصنّفین کی تحریروں سے ہُوا، لیکن اُن کی خاص توجہ اور
دلچسپی کا مرکز گوئٹے کا دیوان تھا، جس کی بہت سی نظمیں مشرقی ادبیات اور خصوصاً
" فارسی " ادبیات سے متاثر دکھائی دیتی ہیں۔ بالخصوص عالمِ پیری میں جب
گوئٹے کی عمر ۶۵ سال کی تھی اور اُس کے افکار و احساسات زندگی کی معنوی ضروریات
کے متعلق بہت پختہ ہو چکے تھے، اُسے دیوانِ حافظ ' کا مکمل ترجمہ دیکھنے کا
اتّفاق ہُوا۔ حافظ کا کلام چونکہ تصوّف و معرفت کے عناصر سے وجد انگیز حد تک
معمور ہے، لہٰذا گوئٹے مشرق کی رُوحانی عظمت و فوقیت کا تہ دل سے قائل
ہو گیا۔ چنانچہ گوئٹے کا مشہور سوانح نگار بیل سوشکی لکھتا ہے :-

" بُلبلِ شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی
اُسے کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری ہی رُوح حافظ کے
پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی
مسرّت، وہی آسمانی محبّت، وہی سادگی، وہی عمق، وہی جوش و

حرارت، وہی وسعتِ مشرب، وہی کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی! غرض ہر بات میں ہم اُسے حافظ کا مثیل پاتے ہیں۔ جس طرح حافظ لسان الغیب و ترجمان اسرار ہے، اسی طرح گوئٹے بھی ہے۔ اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہانِ معنی آباد ہے، اسی طرح گوئٹے کے بے ساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر و غریب سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا (حافظ نے تیمور کو، اور گوئٹے نے نپولین کو)، اور دونوں عام تباہی و بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان و سکون کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنّم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے"۔

پس یہ کلامِ حافظ کا پیدا کردہ ذوق و شوق تھا، جس کے تقاضے سے گوئٹے نے فارسی کے بعض دیگر ممتاز اساتذۂ شعر کے کلام کا بھی مطالعہ کیا۔ چنانچہ ایک مقام پر اپنے آپ کو عالمِ خیال میں ایک ایرانی شاعر تصوّر کرتے ہوئے، جسے جرمنی میں جلاوطن کر دیا گیا ہو، وہ رقم طراز ہے:۔

"اے فردوسی! اے جامی! اے سعدی! تمہارا بھائی زندانِ غم میں
اسیر شیراز کے پھولوں کے لئے تڑپ رہا ہے!"

گوئٹے کی سوانح عمری بتاتی ہے کہ وہ آخری عمر میں قرآنِ مجید کے جرمن ترجمے کو بھی بکثرت مطالعہ کیا کرتا تھا اور اِس کتابِ مقدس کی رُوحانی، اخلاقی اور تعمیری عظمت کو تسلیم کرتا تھا۔ آخر ان چیزوں کی عقیدت و محبّت نے ایسی نظموں کی صورت اختیار کی جن میں گوئٹے فی الواقع مشرق کے سینے سے رُوحانی حرارت کا متلاشی دکھائی دیتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اِس مبارک تقاضے کی قدر و منزلت کو کما حقہٗ سمجھا اور "پیامِ مشرق" کے عنوان سے ایک ایسی جامع کتاب تیّار کی، جس میں یورپ کی رُوحانی پیاس کو بُجھانے کا موثّر ترین اور موزوں ترین مواد موجود ہے!

اگر ایسی تمام نظموں کا حاصل و جوہر نکالا جائے جو علّامہ مرحوم نے خصوصاً اہلِ یورپ سے خطاب فرما کر تحریر کی ہیں، تو وہ مختصراً یہ ہوگا کہ محض "عقل" کی غلامی سے نجات پا کر "عشق" سے باطنی فیض حاصل کرو۔ عقل صرف مادیات میں محصور ہے، ظواہر کی پرستار ہے۔ تنقید اور منطقی استدلال کی خوگر ہے۔ حالانکہ عشق (بمعنی "ایمان") اپنے یقین و اذعان کی قوّت سے افکار و اعمال میں مرکزیت پیدا کر کے دل کو کامل اطمینان عطا کرتا ہے، اور انسان میں عزم و

استقلال کی ناقابلِ تسخیر صفات پیدا کرتا ہے، جس سے اُس کی "جرأتِ رندانہ" ایسے ایسے محیّر العقول کارنامے انجام دیتی ہے جو اوراقِ تاریخ کے لئے باعثِ فخر و مباہات ہیں۔ چنانچہ عشق و عقل کے متعلق جملہ مباحث کا خلاصہ "پیامِ مشرق" کے مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ ہو: ؎

دانش اندوختۂ، دل زکف انداختۂ
آہ زاں نقدِ گراں مایہ کہ در باختۂ!

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست

نقشے کہ بستۂ، ہمہ اوہامِ باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

پس اقبالؒ کے نزدیک یورپ کی رُوحانی اور اخلاقی تجدید صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کی عقل غلامِ ہوا و ہوس ہونے کی بجائے "ادب خوردۂ دل" ہو، اور اقبال دل کو "دل" تسلیم ہی نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ سوزِ عشق (جذبۂ ایمان)

سے کلّی طور پر معمور نہ ہو۔ اسی بنا پر محرومِ عشق "مسلمان" تک کا لحاظ نہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :ـ

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو، تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

غرض مجموعی طور پر "پیامِ مشرق" کی نسبت علامہ اقبالؒ خود تحریر فرماتے ہیں :ـ

"پیامِ مشرق کے متعلق، جو "مغربی دیوان" سے سو سال بعد لکھا گیا ہے، مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملّی حقائق کو پیشِ نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی "باطنی تربیت" سے ہے اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب (جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں کر سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں)، ایک بہت بڑے رُوحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پُرانی

دُنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے، اور تہذیب و تمدّن کی خاکستر سے فطرتِ زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم، اور اُس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے، جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن سٹائن اور برگسان کی تصنیفات میں ملتا ہے"۔

اور بالآخر علامہ مرحوم اپنی ساری جدوجہد کا حقیقی نصب العین جس بلیغ اور حسین و جمیل صورت میں تحریر فرماتے ہیں، اُس کا اندازہ مندرجۂ ذیل الفاظ سے کیا جاسکتا ہے:-

"مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے، مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب برپا نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا ایک خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک اُس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جسے قرآن نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی فارسی تصانیف میں ہمیشہ اسی صداقت

کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت دُنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے اُن میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید و تولید ہو، قابلِ احترام ہی نہیں بلکہ قابلِ رشک و تقلید بھی ہے"۔

اِن تاثّرات سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ اہلِ مشرق کو بھی "پیامِ مشرق" کے افہام و تفہیم کی اُسی قدر ضرورت ہے، جس قدر اہلِ مغرب کو۔ بلکہ بہ نگاہِ انصاف دیکھیے تو اقوامِ مشرق میں مسلمان قوم اِس لحاظ سے زیادہ غافل و مجرم ہے کہ اُس نے خیر الامم، حاملِ قرآن، اور انتہائی طور پر مدّعیِ رُوحانیت ہونے کے باوجود اپنے مخزنِ رُوحانیت و منبعِ سعادت (قرآن مجید) سے افسوسناک بے اعتنائی اختیار کر رکھی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آج وہ رُوحانی افلاس میں دُنیا کی کسی دُوسری قوم سے کسی صورت میں بہتر نہیں۔ حالت یہ ہے کہ آج ہم میں اپنے خلفاء، صوفیہ، شہداء، آئمّہ دین اور اولیاء اللہ کے قدیم رُوحانی و ملّی کارناموں پر فخر و ناز کا جذبہ تو ضرور ہے، لیکن ہم ذاتی طور پر نہ تو کسی رُوحانی قوّت کے حامل ہیں، اور نہ اُس کی تحصیل کے لئے دیانتداری سے آمادۂ جدوجہد! اسی بنا پر

علّامہ مرحوم نے "جوابِ شکوہ" میں ایک جگہ ارشاد فرمایا تھا کہ : ؎

ہر مسلماں رگِ باطل کے لئے نشتر تھا
اُس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اُسے، قوّتِ بازو پر تھا
ہے تمھیں موت کا ڈر اُس کو خُدا کا ڈر تھا

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیوں کر ہو؟

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تُم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

غرض اس زعمِ باطل میں گرفتار رہنا سراسر محرومی و کم نصیبی کا باعث ہو گا کہ "پیامِ مشرق" ایک "پیام" ہے صرف اہلِ مغرب کے لئے۔ حالانکہ اس فارسی شاہکار کے بیشتر عناصر پُکار پُکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہمارا خطاب غیر مسلم کی نسبت "مسلم" سے بدرجہا زیادہ ہے۔ کیونکہ وہ اپنی دیرینہ معجز نما روحانی قوّتِ تسخیر سے یکسر بیگانہ و محروم ہو چکا ہے، جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ اُس کے اعمال و اخلاق میں اسلامی تعلیمات کی کوئی صحیح اور تسلّی بخش جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ بہ الفاظِ دیگر

آج کا مسلمان بھی اپنے عقائد و اعمال میں یورپ کی طرح پابندِ "عقل" تو ضرور ہے لیکن فیضیابِ "عشق" کی صورت میں نہیں۔ وہ "زبان" سے ایمان ویقین کے متعلق جو بلند بانگ دعوے کرتا ہے، اکثر حالات میں "دل" نہ تو اُن کا قائل ہے اور نہ مصدّق! گویا حسبِ آیۂ قرآنی: یَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ "وہ جو کچھ اپنی زبانوں سے کہتے ہیں وہ کچھ اُن کے دِلوں میں موجود نہیں ہوتا"

پس مَیں نے اُمّتِ مسلمہ کے لئے پیامِ مشرق کی چند در چند تعمیری خصوصیات کو مدِ نظر رکھ کر اسے اُردو نظم میں منتقل کرنا نہایت ضروری سمجھا۔ یوں تو اِس کتاب کی ہر چھوٹی سے چھوٹی نظم ایک عظیم الشان رُوحانی یا اخلاقی پیغام کی حامل ہے، تاہم میرے نزدیک "رباعیات" کا حصّہ افادی و اصلاحی لحاظ سے نہایت ضروری حصّہ ہے۔ ہر رباعی میں حکمت و موعظت کے انقلاب انگیز دریا موجزن ہیں، جو ہر گام پر ہمیں یہی دعوت دیتے چلے جاتے ہیں کہ: ؎

زقید و صیدِ نہنگاں حکایتے آور

مگو کہ زورقِ ما آشنائے دریا نیست

باقی رہی نفسِ ترجمہ کی بحث، تو اِس کے متعلق اساتذۂ فن نے چند بنیادی اصول وضع کئے ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ ترجمے میں مصنف کا حقیقی مفہوم و مقصد بالکل فوت نہ ہو!

۲۔ ترجمے کے الفاظ میں ایسی افراط و تفریط نہ ہو جس سے اصل مفہوم کہیں مسخ ہوتا ہُوا دکھائی دے!

۳۔ ترجمے میں اصل تصنیف کا زور و اثر پایا جائے، اور وہ کہیں بھی غیر فصیح پھُسپھُسا اور بے جان معلوم نہ ہو!

۴۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ترجمہ اپنی چُستیٔ بندش، موزونیٔ الفاظ، حُسنِ ترتیب اور نغمۂ صوتی کی بنا پر "ترجمہ" نہیں، بلکہ ایک اصل تخلیق معلوم ہو!

چنانچہ جب مَیں نے "پیامِ مشرق" کو اُردو نظم میں منتقل کرنے کے لئے قلم اُٹھایا، تو اِس اطمینان کی بنا پر کہ مَیں ترجمے کی مذکورہ بالا شرائط کا حق یقینی طور پر ادا کر سکوں گا۔ اور اب کہ بفضلہٖ تعالیٰ ترجمہ ہر جہت سے مکمّل ہو چکا ہے، مَیں ہر خوش فہمی اور شک و شبہ سے بالاتر رہ کر سو فی صدی مطمئن ہوں کہ مَیں نے ترجمے کی مقتضیات کو کما حقّہٗ ادا کر دیا ہے۔

قارئین اِس ترجمے کو ایک "تحت اللّفظ" ترجمہ ہرگز تصوّر نہ فرمائیں۔ یہاں مکّھی پر مکّھی مار کر مطالب و معانی کو محض طلسمِ الفاظ پر قربان نہیں کیا گیا۔ یہ ایک

"آزاد" ترجمہ ہے، جس میں شاعر کے اصل مفہوم و مدّعا کو زیادہ سے زیادہ واضح اور بسیط صورت میں پیش کیا گیا ہے!

بالآخر مجھے سب سے زیادہ خوشی اِس چیز کی ہے کہ مَیں نے فارسی زبان سے ناواقف حضرات کے لئے "پیامِ مشرق" کو اپنی مُلکی زبان یعنی اُردو کا لباسِ جمیل پہنا کر رُوحِ اقبال رحمہ کو ایک بڑی حد تک مسرور کیا ہے، اور یہی چیز میری محنت و کاوش کا عظیم ترین صلہ ہے!

عبدالرحمٰن طارق

لالۂ طور

(رباعیات)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لالۂ طور

۱

اُس کی تیغِ ناز کی مقتول ہے بزمِ وجود
اور نیاز و عجز سے روشن ہے نقشِ[۱] ہست و بود
اِس حقیقت کی شہادت دیکھ لے خورشید میں
وہ جبینِ صبح پر گویا ہے اِک داغِ سجود

[۱] نقشِ ہست و بود : مُراد اشیائے کائنات

۲

میرے دِل کو نُور افشاں کر گیا سوزِ دروں

آنکھ کو میری جہاں بیں کر چکا ہے اشکِ خوں

یا الٰہی! رمزِ ہستی سے رہے بیگانہ تر

جو یہ کہتا ہے کہ جوشِ عشق ہے جوشِ جنوں

۳

عشق کی بادِ بہاری سے ہُوا گلشن حسیں

عشق سے جنگل میں بھی روشن ہے غنچوں کی جبیں

بحر کی تہ تک بھی پہنچی ہیں شعاعیں عشق کی

عشق ماہی کو عطا کرتا ہے چشمِ راہ بیں

۴

عشق سمجھا ہے عقابوں کو حقیر و کم بہا
عشق ہی کنجشک کو شاہیں سے دیتا ہے لڑا
گرچہ دِل کرتا ہے ہر دم عشق کی زد سے گریز
عشق ہوتا ہے مگر خود اس کی تہ سے رونما

۵

عشق ہی خود لالہ و سوسن میں رنگ آمیز ہے
عشق ہی احساسِ انساں میں بلا انگیز ہے
غور سے دیکھیں اگر ہم چیر کر یہ خاکداں
عشق ہی زیرِ زمیں بھی غالب و خوں ریز ہے

ا کم بہا : کم قیمت ، غیر وقیع   ۲ کنجشک : چڑیا

۶

ہر کس و ناکس محبت سے ہوا کب مایہ دار

کب ہے ممکن ہر کسی کو ہو محبت سازگار

عشق کے شعلے سے ہے لالے کا سینہ داغ داغ

دل مگر لعلِ بدخشاں کا ہے بے سوز و شرار

۷

گلشنِ عالم میں دائم ہوں پریشاں مثلِ بُو

کچھ نہیں معلوم کس شے کی ہے مجھ کو جستجو

آرزو میری بر آئے یا نہ آئے دہر میں

ہوں بہر صورت شہیدِ سوز و سازِ آرزو

۸

دِل ہی بس روح و رواں دنیا کی مشتِ گِل میں ہے
خون کی اِس بوند سے سارا جہاں مشکل میں ہے
خود ہی دھوکے سے ڈوبیں ہے اپنی چشمِ پُر ہوس
ورنہ ہر انسان کی دنیا اُسی کے دِل میں ہے

۹

باغباں سے ایک بُلبُل نے کہا وقتِ سحر
دہر کی مٹّی سے اُگ سکتا ہے بس غم کا شجر
خارِ صحرا منزلِ پیری میں رکھتا ہے قدم
گُل جواں ہوتے ہی مرجاتا ہے گر کے خاک پر

۱۰

یہ جہانِ پیر جس کی بود ہے گویا نبود
حاملِ نقص و زیاں ہے اس کا ہر اندازِ سود
توڑ کر کہنہ سرا تعمیر کر اک قصرِ نو
دل نہیں برداشت کرتا اس کا بارِ دیر و زود

۱۱

قلبِ آدم نغمہ ہائے عشق کا ہے ایک ساز
منکشف کرتا ہے رازوں کو، مگر خود بھی ہے راز
حق نے دنیا کو بنایا، خوب تر اس نے کیا
پیشِ خالق ہے یہ اس شرکت پہ بھی محوِ نیاز

۱ بود : وجود ۲ نبود : عدم ۳ سود : فائدہ

۱۲

ابتدا و انتہا کی کچھ نہیں ہے آرزُو

راز ہوں، مجھ کو جہانِ راز کی ہے جستجُو

کوئی اُلٹے بھی اگر روئے حقیقت سے نقاب

چاہتا ہوں مَیں وہی تخمین وظن[1] کے رنگ و بُو

۱۳

کب تلک بھولے گا اے دل شیوۂ مردانہ کو

تُو نیا ہے گا کہاں تک عادتِ پروانہ کو

اپنے ہی شعلوں میں اے نادان جل کر راکھ ہو

تا کُجا چاہے گا آخر آتشِ بیگانہ کو

[1] تخمین وظن: شک و شبہ کیونکہ حقیقت کی تحقیق بحالتِ شک کی جاتی ہے نہ کہ بحالتِ یقین۔

۱۴

گرچہ تیری اصلِ ہستی ہے فقط مشتِ غبار
تن بنا محکم کہ رشک اس پر کرے سنگیں حصار[1]
جسمِ محکم میں ہو تیرے اک دلِ درد آشنا
جس طرح ندی سے رخشاں ہے کنارِ کوہسار

۱۵

آدمِ خاکی بنایا حق نے فردوسِ نظر
اور یہ عالم کیا پیدا ارم سے خوب تر
ڈال کر ساقی نے لیکن مجھ پہ آبِ آتشیں[2]
میری مٹی سے بنا دی ایک دُنیائے دگر

[1] حصار: قلعہ [2] آبِ آتشیں: مراد شراب

۱۶

روزِ محشر برہمن کہنے لگا اللہ سے
تھا فروغِ زندگی جیسے ہو اک تابِ شرر
حق ہے تُو اور حق ہی کہتا ہوں، نہ ہو تجھ کو جو رنج
تیرے آدم سے تو تھے میرے صنم پائندہ تر

۱۷

صبح کے تارے! گیا تُو اِس جہاں سے تیز گام
کچھ پسند آیا نہ تجھ کو میرے سونے کا نظام
مَیں ہوں اپنی غفلتوں سے دہر میں گُم کردہ راہ
جاگتا آیا گیا تُو، خوب ہے تیرا خرام

۱۸

دہر کا مے خانہ ہوتا شورِ رنداں سے تہی
خاکِ آدم میں نہ ہوتا یہ شرارِ زندگی
عشق اور ہنگامہ ہائے عشق رہتے کالعدم
عقل کی مانندِ دل رکھتا اگر فرزانگی[۱]

۱۹

تُو ہے نو پرواز، حق نے جب تجھے پیدا کیا
گلشنِ عالم میں تُو ہونے لگا بال آزما
ہم کو کرتی ہے گراں پرواز دنیا کی ہوس
تُو چمن میں لذّتِ پرواز سے ہے پر کُشا

---

۱ فرزانگی: عقل و شعور۔ عقل مصلحت اندیش ہے، مگر دل جراتِ رندانہ رکھتا ہے۔
۲ گراں پرواز: سست پرواز۔

۲۰

کیا ہی پُر لذّت ہے یارب یہ نظامِ[1] ہست و بود

موج زن ہے دل میں ہر ذرّے کے اک جوشِ نمود

غنچۂ گل نے کیا جب شاخ میں اپنی شگاف

اُس کے لب پر مسکراہٹ بن گیا شوقِ وجود

۲۱

حق سے پروانہ لگا کہنے عدم میں باادب

زندگی میں دے مجھے تو ایک دم کی تاب و تب[2]

خواہ میری خاک کو کر دے پریشاں صبح دم

سوز و سازِ قلب کی لیکن عطا کر ایک شب

سلہ نظامِ ہست و بود: کائنات کا نظام سلہ تاب و تب: روشنی اور حرارت ۔

۲۲

اے مسلماں! میرے دل میں ہے وہ اک حرفِ جلیل
جس کی تابانی سے شرمندہ ہے جانِ جبرئیل
آزرانِ[1] عہد سے میں اُس کو رکھتا ہوں نہاں
کیونکہ ہے بُت خانۂ عالم میں وہ رازِ خلیل

۲۳

اے مرے دل! تُو ہے کوئے یار کی جانب دواں[2]
چھوڑے جاتا ہے مجھے فرقت میں تنہا نوحہ خواں
آرزوئیں ہی کیا کرتا ہے پیدا دم بہ دم
عظمتِ کردار کا اب تک نہیں تُو رازداں

۱۔ آزرانِ عہد: وقت کے کافر و سرکش لوگ ۲۔ دواں: بھاگ رہا ہے۔

۲۴

سینۂ انجم میں بھی تو ڈھونڈتا ہے راستا
ہے مگر اپنی حقیقت سے ابھی نا آشنا
اپنی ہستی پر برنگِ دانہ چشمِ شوق کھول
تا درختِ پُر ثمر دانے سے پیدا ہو ترا

۲۵

صبح نے جس دم سجائی شاخسارِ بوستاں
دے رہا تھا مجھ کو یہ پیغام مرغِ نغمہ خواں
جو بھی سینے میں نہاں ہے آشکارا کر اُسے
آہ ہو، نغمہ ہو، نالہ ہو کہ ہو دودِ فغاں!

۲۶

تجھ پہ میں اک نکتۂ سربستہ کرتا ہوں عیاں
تُو اگر لے مجھ سے رمزِ زندگانی کا نشاں
جان اگر تو جسم میں رکھتا نہیں مر جائے گا
جان اگر رکھتا ہے۔ پائے گا حیاتِ جاوداں!

۲۷

ختم کر اے ہم نشیں! اب ذکرِ شمعِ دود پوش
اس کے جلنے کا فسانہ بن چکا آزارِ گوش
مَیں اسی پیرائے کو پروانہ کرتا ہوں خیال
محفلِ دنیا میں ہے جو سخت کوش و شعلہ نوش

۲۸

تجھ کو غافل خود سے کر دیتا ہے وہ اے مشتِ خاک
میری محفل میں نہ پائے گا تو ہرگز آبِ تاک[1]
جز جنونِ عشق کوئی بھی نہیں میری متاع
مثلِ گل رہتا ہوں میں اس بوستاں میں سینہ چاک

۲۹

جان اگر تیری نہیں اب تک شہیدِ جستجو
توڑ بیٹھے گا مرے گلشن میں تو جام و سبو
میں دکھاتا ہوں تجھے جو ہے رگِ گل میں نہاں
مت سمجھ میری بہاروں کو طلسمِ رنگ و بو

[1] آبِ تاک: انگور کی بیل کا پانی، مراد شراب ۔

۳۲

یا الٰہی! یوں تو دنیا ہے تری وقفِ ثنا
عِشق کے ساغر سے تُو نے سب کو بیخود کر دیا
گو نظر سے ہے نظر پیوستہ مثلِ رنگ و بُو
جان سے ہے جان، دل سے دل مگر نا آشنا

۳۳

خضر سے بولا سکندر سُن یہ پُر معنی خبر
چھوڑ خلوت، ہو شریکِ سوز و سازِ بحر و بر
زندگی کی جنگ کو تُو دیکھتا ہے دُور سے
عرصۂ پیکار[۱] ہی میں مر کے ہو جا زندہ تر!

۱؎ عرصۂ پیکار: میدانِ جنگ

۳۰

بحر بن جا۔ چھوڑ دے یہ ورطۂ[1] بود و عدم
پست ہو تیری بلندی سے جہانِ کیف و کم[2]
کر خودی تعمیر دل میں نفس کے بُت کو گرا
ہو تو ابراہیمؑ کی مانند معمارِ حرم!

۳۱

مَیں ہوں مرغانِ چمن سے دور اور ناآشنا
ہوں اکیلا آشیاں کی شاخ پر نغمہ سرا!
تُو ہے نازک دل اگر، کر میری محفل سے گریز
کیونکہ میرا خون ٹپکاتی ہے خود میری نوا

---

[1] ورطۂ بود و عدم: وجود اور عدم کا بھنور۔ مراد یہ محدود عالم جس میں پابندیٔ مکان لگی ہوئی ہے۔
[2] جہانِ کیف وکم: وہ جہان جس کا مدار کیسا اور کتنا پر ہو۔ محدود دنیا۔

۳۴

خاک تختِ کیقباد اور خاک ہے اکلیلِ جم[1]
خاک ہیں آخر کلیسا و بتستان و حرم
میری فطرت میں مگر کیا جانے کیا ہے امتیاز
ہے نظر افلاک پر، انجام ہے گو موت و غم

۳۵

تیری ہستی میں اگر حق نے کیا ہے آشکار
اک دلِ درد آشنا، اک دیدۂ خونابہ بار
سیکھ ابرِ نو بہاری سے تُو رونے کا طریق
تا کہ فیضِ اشک سے تیرے اُگے اک لالہ زار

[1] اکلیل جم: جمشید کا تاج

۳۶

ہر گھڑی ہے منقلب نقش و نگارِ زندگی
ایک صورت پر نہیں ہوتا قرارِ زندگی
ہے اگر امروز تیرا سر بسر تصویرِ دوش
خاک میں تیری نہیں باقی شرارِ زندگی

۳۷

جب کروں جلوت[1] میں نغمے کا مکمّل حق ادا
اپنی محفل میں بپا ہنگامہ کر دوں حشر کا
اور اگر چاہوں کہ خلوت میں ذرا ہوں گوشہ گیر
کُل جہاں کو ساغرِ دل میں کروں غرقِ فنا

[1] جلوت: مجلس، بزم ٭

۳۸

مجھ سے مت تحقیق کر اے ہم نشیں تفسیرِ دل
عقل ہی کے سوز سے پیدا ہوئی تصویرِ دل
سوز سے دل دل تھا لیکن جب ہُوا محرومِ سوز
دِل ہی گویا گل ہُوا، اور مِٹ گئی توقیرِ دل

۳۹

عقل بولی۔ آنکھ میں کھپتا نہیں ربِّ کریم
اور نظر پر اس سے طاری ہے سدا امید و بیم
حشر تک کہنہ، نہیں ہوگا فسانہ طُور کا
موج زن ہر دل کے اندر ہے تمنّائے کلیم

۴۰

مسجد و بُت خانہ و دیر و کلیسا بس یہی

ایک مشتِ گل ہے لے دے کر تری صنعت گری!

کب رہائی قید سے ہو غیر کی، دل کے بغیر

تیرا دامن گوہرِ دل سے ہے اے غافل! تہی

۴۱

قید کیوں کرتا مجھے دُنیائے دُوں کا بوستاں

دِل کی پروازوں سے تھا کوتاہ بندِ این و آں

صورتِ بادِ صبا پھولوں کو دے کر آب و رنگ

ہو گیا آخر عدم آباد کو مَیں بھی رواں

لے مشتِ گل: خاک کی مٹھی۔ فرماتے ہیں۔ کہ مذکورہ عبادت خانوں کی تعمیر "مشتِ گل" ہی سے تو ہے۔ اصل مقصود محض تعمیر عبادت گاہ نہیں بلکہ "اطاعت حق" تھا۔

۴۲

مَیں نے ساغر میں انڈیلی ہے وہ صہبائے جواں[1]
رندِ کہنہ کو بھی جو کر دے خودی کا راز داں
پیروِ پیرِ مغاں ہوں، فیض ہے جس کا قدیم
چشمِ ساقی نے کیا مے کا یہاں پید اسماں

۴۳

ہے شرابِ عشق سے مٹی بھی میری جامِ جم[2]
عشق ہی نے میرے قطرے کو بنایا رشکِ یم[3]
عقل نے سر میں مرے آکر سجایا بُتِ کن
پھر خلیلِ عشق نے یہ دیر کر ڈالا حرم

۱۔ صہبائے جواں: تیز و تند شراب ٭ ۲۔ جامِ جم: جمشید کا پیالہ جو جہاں نما تھا ٭
۳۔ یم: دریا، سمندر ٭

۴۴

عقلِ انساں ہے اسیرِ زنجیرِ امروز و دوش[1]
ہے وہ کافر اور پرستارِ بُتانِ چشم و گوش[2]
گو زباں پر ذکرِ حق ہے آستیں میں ہیں صنم
عقل ایسی ہے برہمن زادۂ زنّار پوش

۴۵

عقل کو حق نے کیا ہے ہر کسی کا رہنموں
دوسروں کی مثل میرا جسم بھی ہے خاک و خوں
پا نہیں سکتا کوئی اِس راز کو میرے سوا
ہے ضمیرِ خاک و خوں میرا ہمیشہ بے چگوں[3]

۱۔ امروز و دوش :- آج اور کل ۔ مراد یہ کہ عقل " زمان " کی قیدی ہے ؛
۲۔ بُتانِ چشم و گوش : وہ اشیائے کائنات جن کی آنکھ اور کان کو ہر وقت ہوس رہتی ہے مثلاً حُسن ، دولت ، موسیقی ، رقص وغیرہ ؛
۳۔ بے چگوں : جس کی کوئی معین اور مخصوص ہیئت کذائی نہ ہو ؛

۴۶

اک تجلّی کا گدا بن کر تُو پہنچا طور پر
دِل ترا اُس وقت تھا حُسنِ خودی سے بے خبر
نفس کے بندوں سے بچ کر ڈھونڈ کوئی آدمی
خود خدا بھی ڈھونڈتا ہے آدم والا گھر

۴۷

دے کوئی جبرئیل کو اقبال کا جا کر پیام
گو ہمیں حاصل نہیں ہے جسمِ نوری کا مقام
دیکھ ہجرِ دوست میں آدم کا سوز و اضطراب
جسمِ نُوری پر ہے لیکن ذوقِ مہجوری حرام

۴۸

تا ہمائے علم اسیرِ دام ہو جائے وہیں
غرق شک رہ اور نہ کر تو علم پر اپنے یقیں
اور اگر چاہے عمل، کر لے یقیں کو پختہ تر
"ایک" کا طالب ہو اور رکھ اک ہی چوکھٹ پر جبیں!

۴۹

عقل میری خود بنی ہے تیرے رُخ کی پردہ دار
اور نگاہِ شوق جلوے کے لئے ہے بے قرار
اس بنا پر ہر گھڑی عشق و خرد میں جنگ ہے
کس مصیبت میں پھنسائی تُو نے میری جانِ زار؟

۵۰

دل پہ تیرے موت کا ڈر ہی سدا طاری رہا

خوف سے چہرہ مریضوں کی طرح پیلا ہوا

لوٹ کر اپنی طرف آ، پختہ کر اپنی خودی

بعد مرنے کے بھی پائے گا ہمیشہ کی بقا

۵۱

پوچھتا ہے مجھ سے کیا تُو جان و تن کا ماجرا

چند و چوں[۱] کے دام کا ہرگز نہیں قیدی ہوا

ہوں دمِ آشفتہ[۲] اور کھاتا ہوں ہر دم پیچ و تاب

جب اُٹھا آغوشِ نَے سے، بن گیا شورِ نوا!!

۱؎ چند و چوں : کتنے اور کیسے؟ — یہ بحث فقط مادیات سے تعلق رکھتی ہے، جس سے شاعر اظہارِ بیزاری کرتا ہے۔

۲؎ دمِ آشفتہ : پریشان سانس۔

۵۲

پیرِ دانا نے مجھے بھیجا ہے یہ روشن پیام
ہے ترے "امروز" میں مستور "فردا" کا نظام
حُسنِ ہرجائی سے اپنے قلب کو محفوظ رکھ
جُز خدا غیروں کو دینا دِل کا ہے مطلق حرام

۵۳

پُوچھ مت رازی سے تُو تفسیرِ قرآنِ جلیل
ہے فقط دِل ہی مرا آیاتِ قرآں کی دلیل
عقل جس دم آگ بھڑکاتی ہے، جل جاتا ہے دِل
ہے یہی اے بے خبر تفسیرِ نمرود و خلیلؑ

۵۴

کس طرح مَیں حل کروں یہ عقدۂ بود و نبود

جب کہوں "مَیں ہوں!" تو کہتے ہیں یہ ہے فخر و نمود

میرے سینے سے مگر کس شوخ کی آئی صدا

کوئی کہتا ہے کہ "مَیں ہوں! مان لے میرا وجود!"

۵۵

شاعرِ رنگیں بیاں کو یہ مرا پیغام دے

لالے کی مانند جلنے سے ہے کیا حاصل تجھے

آگ سے تیری نہ ہے خود تیری ہستی ہی گداز

اور نہ شامِ غم ہوئی پُرنور تیرے سوز سے

۵۶

تیرے خوب و زشت[1] کا معیار ہے سود و زیاں[2]
اس لئے مَیں تیری قدروں کا نہیں ہوں راز داں
اس بھری محفل میں کوئی مجھ سے تنہا تر نہیں
اور ہی نظروں سے مَیں تو دیکھتا ہوں یہ جہاں

۵۷

حشر پر اپنے ہی تو اے شیخ کیا کرتا ہے ناز
عشق کا بھی ہے یہاں اک محشرِ اُلفت نواز
نامہ و میزان و پرسش ہی نہیں اس حشر میں
مسلم و کافر میں یہ کرتا نہیں کچھ امتیاز

[1] خوب و زشت: خوبصورت اور بدصورت۔ [2] سود و زیاں: فائدہ اور نقصان۔

۵۸

قطرہ پانی کا جو لے اپنی خودی سے آب و تاب

گوہرِ صد دانہ ہیں وہ گوہرِ یک دانہ ہو

ہم نواؤں کی بھری محفل میں جی اس طور پر

گلشنِ ہنگامہ آرا[1] تجھ کو خلوت خانہ ہو

۵۹

ہوں عجب انجمن میں اے دانش ورانِ باکمال

عقل کو اس راز کا پانا ہُوا بالکل محال

جسمِ خاکی میں ہمارا دِل رہے کیونکر خموش

کیونکہ وہ ہے خود ہی اک دشتِ غزالانِ خیال[2]

---

[1] گلشنِ ہنگامہ آرا: شور و غوغا سے معمور دنیا۔ [2] دشتِ غزالانِ خیال: غزال: ہرن یعنی وہ جنگل جس میں خیالات کے ہرن ہر وقت چوکڑیاں بھر رہے ہیں۔

۶۰

مت سجا ساحل پہ بزمِ عیش اے ناداں کبھی
ہے وہاں آہستہ اور مدھم نوائے زندگی
کُود کر دریا میں ہو موجوں سے تُو جنگ آزما
جاودانی زندگانی کا طریقہ ہے یہی!

۶۱

گنجِ معنی کا ہوں میں دُنیا میں اک سربستہ باب
حرف بافوں کی نگاہوں سے ہے مجھ کو اجتناب
کچھ نہیں رشتہ مجھے "مختار" سے "مجبور" سے
میری خاکِ زندہ میں مخفی ہے ذوقِ انقلاب

۱؎ حرف باف: محض باتونی اور منطقی لوگ جو سوزِ عشق سے محروم ہیں۔
۲؎ مختار و مجبور: "مختار" وہ لوگ جو انسان کو عمل میں مختارِ کُل تسلیم کرتے ہیں۔ "مجبور" وہ لوگ جو انسان کو عمل میں حسبِ تقدیر مجبور اور بے بس خیال کرتے ہیں۔

۶۲

زندگی کو کر نہ منزل کے تصوّر سے تباہ
اُس کے ذوق و شوق سے بیگانہ ہے تیری نگاہ
کیف و مستی سے سفر کی اس قدر سرشار ہوں
ہو گئی منزل بھی میری راہ میں اک سنگِ راہ

۶۳

تُو نے جب ڈالیں نگاہیں پارہ ہائے سنگ پر
تیرے فیضِ آرزو سے بن گئے وہ بھی گہر
بندۂ زر! زر کے بدلے بیچ مت اپنی خودی
زر کو تیری ہی نظر سے ہے میسّر شانِ زر

۶۴

قلب تھا روزِ ازل سے بے وفا، بیگانہ خُو
اضطراب اُس کا بڑھاتی ہی رہی ہے جستجُو
دل نے جب دیکھا "اُسے" سینے سے میرے اڑ گیا
کیا خبر مجھ کو کہ یہ طائر تھا دست آموزِ ھُو![1]

۶۵

پُوچھ مت عشقِ فسوں پیشہ کی مجھ سے داستاں
اِس کو جس صورت میں چاہو، ہے اسی میں یہ عیاں
عشق دل میں نقطۂ پرکار سے زائد نہیں
جب مگر آئے زباں پر، ہے یہ بحرِ بے کراں!

[1] دست آموزِ ھُو: اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کا سدھایا ہُوا طائر۔ مراد عاشقِ حق۔

۶۶

کیوں ہُوا دلگیر تُو اے غنچۂ حسرت نوا
گلشنِ عالم میں ہے مطلوب تجھ کو اور کیا؟
آبجو ہے، بزمِ گُل ہے مرغِ خوش پرواز ہے
اوس کے گوہر، نوائے صبح دم، رقصِ صبا!

۶۷

ایک گُل مجھ سے لگا کہنے یہ ہو کر سوگوار
باغ میں میری نمو ہے مثلِ پروازِ شرار
محنتِ نقش آفریں پر دِل ہُوا میرا کباب
نقش اُس کے ہیں حسیں لیکن سدا ناپائدار!

۶۸

کچھ کنارہ ہی نہیں میرے جہانِ شوق کا
مثلِ ماہی وہ زماں کے بحر میں گم ہو گیا
دیکھ اپنے دل کی وسعت کو نگاہِ غور سے
قلزمِ ایّام ہے اک جام میں ڈوبا ہُوا

۶۹

مَیں ازل سے غنچہ ہائے بے زباں کی ہوں زباں
باغ کے طائر رہے میرے سدا ہم داستاں
جب مروں، دینا صبا کے ہاتھ میری مشتِ خاک
کچھ نہیں میرے مقدّر میں بجز طوفِ گلاں!

۷۰

کیا وہی کچھ ہے، نظر آتا ہے جو کچھ بوستاں
دل میں کیا رکھتا ہے آخر لالۂ آتش بجاں؟
ہے نگاہوں میں ہماری گلستاں اک موجِ رنگ
کیا خبر کیا دیکھتی ہے اس کو چشمِ بلبلاں!

۷۱

تُو اگر خورشید ہے تو دِل مرا سیّارہ ہے
مَیں سراپا نُور ہوں، یہ بھی ترا نظّارہ ہے
مَیں تری آغوش سے ہوں دُور رہ کر ناتمام
جانئے تجھ کو جو قرآں، دل مرا سیپارہ ہے

۷۲

ہے تصوّر بھی ترا چشمِ جنوں میں خوشگوار
یا الٰہی! عشق سے رکھ قلب و جاں کو بے قرار
ایک صاحبدل نے یہ نکتہ بتایا ہے مجھے
ہے پسندیدہ بہت منزل سے راہِ پیچ دار

۷۳

عقل میری ہے جہاں میں کافرِ زنّار دار
وہ بتانِ نفس کی ہے بندہ و پروردگار
میرے دل کو دیکھ جو نالاں ہے دردِ عشق سے
چھیڑ میرے دین و آئین کا نہ قصّہ زینہار

۷۴

سروِ گلشن میں اُسی کا بندۂ آزادہ ہے
شوخی و مستئ گل کا راز اُسی کا بادہ ہے
آفتاب و ماہ انجم ہیں سبھی اُس کے حریم[1]
قلبِ انسانی مگر اُس کا درِ نکشادہ[2] ہے

۷۵

صد جہانِ نو بہ نو انجم سے آگے تھے نہاں
عقل جس جا رک گئی سمجھی کہ ہے یہ آسماں
قلب کی وسعت پہ لیکن جب پڑی میری نظر
پالیا سینے میں اپنے اک کرانِ بے کراں[3]

۱؎ حریم: چار دیواری۔ گھر؛ ۲؎ درِ نکشادہ: وہ دروازہ جو ابھی تک نہیں کھولا گیا؛
۳؎ کرانِ بے کراں: بے نہایت ہستی (اللہ تعالیٰ) کا مسکن؛

۷۶

مت ہو اے ناداں تو زنجیرِ قسمت کا اسیر

زیرِ گردوں راہ کافی ہیں اگر ہوں راہ گیر

جب قدم تیرا اُٹھے، دُنیائے نَو ہو منکشف

گامزن ہمّت سے ہو اور بحر و بر کا سینہ چیر!

۷۷

میرا دل ہر لحظہ ہے اپنے ہی جادو میں اسیر

عالمِ امکاں اسی کے عکس سے ہے تاب گیر[1]

میرے صبح و شام کی حالت نہ پوچھو مہر سے

میری پہنائے جہاں ہیں وہ بھی ہے گویا پریر[2]

[1] تاب گیر: روشن ؛ [2] پریر: پرسوں کا دن جو گزر گیا ؛

۷۸

میرے سازِ جاں میں ہے تیرے ہی زخمے سے نوا
جان میں رہ کر بھی ہے تو جان سے کیونکر جدا؟
وصل تیرا زندگی ہے، موت ہے تیرا فراق
اے مرے بے مثل! بے میرے ہے تیرا حال کیا؟

۷۹

سانس میری موجِ آشفتہ اُسی کے یم[1] سے ہے
بانسری میری، مگر نغمہ اُسی کے دم سے ہے
ساحلِ جوئے ابد پر مثلِ سبزہ میں اُگا
ہر رگ و پے میں مرے قوّت اُسی کے نم[2] سے ہے

[1] یم: سمندر، اللہ تعالیٰ کو "یم" اس بنا پر کہا کہ وہ بھی مثلِ بحرِ بے پایاں ہے۔ [2] نم: تری - آب۔

۸۰

دردِ تنہائی تھا دل میں، بزم کی تھی آرزو
کر دیا تخلیق تُو نے یہ جہانِ رنگ و بُو
کیوں خفا ہوتا ہے اب تُو میرے شورِ نالہ سے
تُو نے خود پیدا کیا مجھ میں جنونِ ہائے و ہُو

۸۱

جستجو کس کی ہے تجھ کو کس لئے ہے پیچ و تاب؟
وہ تو ہر شے میں ہے ظاہر، تُو مگر زیرِ نقاب!
خود ہی کو پائے گا تُو، جب پائے گا اللہ کو
خود کو ڈھونڈے گا تو پھر بھی حق ہی ہو گا بے حجاب!

۸۲

مردِ کوِدک خو! تو دے جذبات کو درسِ ادب
تُو ہے اولادِ مسلماں، محو کر نقشِ نسب
امتیازِ خانداں پر، خون و رنگ و نسل پر
ہو عرب نازاں تو کر دے شوق سے ترکِ عرب

۸۳

ہم نہ ایرانی نہ افغاں اور نہ ہیں ترک و تتار
پُھول ہیں گو مختلف، منبع ہے واحد شاخسار
مومنوں پر ہے تمیزِ رنگ و بُو یکسر حرام
ہے ہمارے رنگ و بُو کی اصل اک ہی نوبہار[1]

[1] نوبہار: مراد اسوۂ رسول صلعم جس میں رنگ و نسل کا امتیاز یکسر حرام ہے۔

۸۴

میرے سینے میں نہاں ہے عالمِ بے کیف وکم[1]
خاک میں میری ہے دِل اور دل میں ہے طوفانِ غم
جس شرابِ عشق نے سرشار کی ہے میری جان
اب بھی ہے میرے سبوئے دل میں اُس کا ایک نم!

۸۵

اے دلِ راحت فزا، اے میرے یارِ باوفا
تُو ہی دریا، تُو ہی کشتی، تُو ہی ساحل ہے مرا
اوس کی مانند تُو ٹپکا ہے میری خاک پر
یا مری مٹّی سے تُو غنچے کی صُورت اُگ پڑا

[1] عالمِ بے کیف وکم: وہ دنیا جس کی حقیقت وکیفیت ہنوز نامعلوم ہو۔

۸۶

نکتۂ زشت و نکو کیونکر کروں میں آشکار[1]

لرزہ بر تن ہے زباں معنی ہیں بیحد پیچدار

شاخ سے باہر ہی ثابت ہے وجودِ خار و گُل

شاخ کے اندر نہ گُل صورت نما ہے اور نہ خار

۸۷

جو نہیں ہے عشق کے دردِ دروں کا راز داں

تن وہ رکھتا ہے مگر مفقود ہے اُس تن میں جاں

جسم میں اپنے اگر تجھ کو طلب ہے جان کی

دِل میں پیدا کر گداز و اضطراب بے کراں

---

[1] زشت و نکو : بدصورت اور خوبصورت ⁘

۸۸

پوچھ مت مَیں ہوں کہاں سے میری ماہیّت[1] ہے کیا

جنبشِ پیہم میں پنہاں ہے مرا رازِ بقا

مَیں ہوں دریائے جہاں میں ایک موجِ بے قرار

یوں نہ پیچ و تاب اگر کھاؤں، تو ہو جاؤں فنا

۸۹

اِس قدر جلووں پہ بھی رہتا ہے تو زیرِ نقاب

کیوں نہیں ہوتا نگاہِ شوق پر تو بے حجاب؟

مستیٔ مے کی طرح میرے لہو میں ہے رواں[2]

دوست بن کر بھی ہے تو بیگانہ خو اور دیریاب[3]

[1] ماہیّت: حقیقت [2] رواں: جاری و ساری۔ [3] دیریاب: جو دیر سے ملے۔

۹۰

شوقِ منزل کو فنا کر اور سدا رہ پابراہ[1]

رکھ نظر کو پاک مانندِ نگاہِ[2] مہر و ماہ

دُوسروں کو بخش دے اپنی متاعِ عقل و دیں

جب رہے غم عشق کا ہونے نہ دے اس کو تباہ

۹۱

دل میں آ اے عشق ہے تُو ہی مری رمزِ بقا

تو ہی میری کشت[3] ہے اور تو ہی حاصل ہے مرا

ہو چکے ہیں کہنہ و بوسیدہ یہ خاکی نہاد[4]

میری آب و گل سے تو تعمیر کر آدم نیا

---

[1] پابراہ : مسافر ۔ [2] نگاہِ مہر : مراد شعاع جو نہایت صاف و پاک ہوتی ہے ۔
[3] کشت : کھیتی ۔ [4] خاکی نہاد : مٹی کے بنے ہوئے انسان ۔

۹۲

ہے سخن ہی وجہِ غم اور جانِ جاں ہے دردِ غم

رُوح کو اکسیر ہیں یہ نالہ ہائے دم بدم

عیش کی میرے سکندر کو بھی ہو گی کیا خبر

ہے نوائے دِل نشیں کے سامنے کیا ملکِ جم[1]!

۹۳

تم نہ پاؤ گے مجھے ذی شان گھوڑے پر سوار

سلطنت میں ہیں نہیں کوئی وزیرِ شہریار

واسطے میرے یہی دولت ہے کافی اے ندیم

کھودتا ہوں سینہ جب۔ پاتا ہوں لعلِ آبدار[2]

[1] ملکِ جم: جمشید کی سلطنت ؛ [2] لعلِ آبدار: مراد اشعارِ بلند معیار ؛

۹۴

ہے اگر مطلوب اے مسلم کمالِ زندگی

کھول اپنے قلب ہی پر آنکھ اور کر بند بھی

آب کی مانند اِس دُنیا کو سینے میں اُتار

اور طلسمِ[1] زیر و بالا سے خرد کو کر بری

۹۵

تُو یہ کہتا ہے کہ ہے انسانِ عاجز خاک زاد

ہر گھڑی ہے وہ اسیرِ عالمِ کون و فساد[2]

ناتواں آدم ہے، لیکن فطرتِ اعجاز کار

رکھ چکی ہے جوئے آدم پر سمندر کی نہاد

۱؎ طلسمِ زیر و بالا : نیچے اور اوپر کا جادو، مراد پابندئ مکاں۔ قیدِ جہات ؛

۲؎ عالمِ کون و فساد : یہ دنیا جو بنتی اور بگڑتی رہتی ہے ؛

۹۶

ہے دلِ بے باک کو شیرِ ژیاں بھی ایک رنگ[1]
خائف و کمزور دل کو ہے ہرن بھی اک پلنگ[2]
دل میں جرأت ہو اگر، قلزم بھی ہے صحرا تجھے
ورنہ ہو، تو حلقۂ ہر موج ہے کامِ نہنگ[3]

۹۷

کیا خبر میخانے[4] میں بادہ ہوں یا ساغر ہوں میں
میرے دامن میں گہر ہے، خود ہی یا گوہر ہوں میں
غور سے دیکھوں جو دل کو، راز ہے یہ آشکار
جانِ دیگر ہے مری اور بالیقیں دیگر ہوں میں

۱؎ رنگ: بھیڑ ۲؎ پلنگ: چیتا ۳؎ کامِ نہنگ: مگرمچھ کا منہ ۴؎ میخانے سے مراد ہے میخانۂ عشق۔

۹۸

تُو یہ کہتا ہے مرا طائر[1] ہے دائم زیرِ دام

اور اُڑنا اُس کے بال و پر پہ ہے مطلق حرام

مَیں یہ کہتا ہوں کہ تن سے جان ہے برجستہ تر

تیز کرتا ہے مرے خنجر کو خود میرا نیام!

۹۹

کس بنا پر آرزو پیدا ہمارے دل میں ہے؟

جل رہا کیونکر چراغ اپنا رہِ منزل میں ہے؟

کون ہے اور دیکھتا کیا ہے ہماری آنکھ سے؟

کس طرح دل کی سمائی ایک مشتِ گل[2] میں ہے؟

[1] طائر: مرادِ طائرِ رُوح جو جسمِ عنصری میں مقیّد ہے؛ [2] مشتِ گل: مرادِ جسمِ انسانی؛

۱۰۰

بعد مرنے کے جو دیکھا میں نے جنّت کا سماں
تھے مرے پیشِ نظر اپنے زمین و آسماں
جنّتِ پُر عیش و راحت دیکھ کر حیرت ہوئی
وہ "جہاں" تھا اے خدایا ایک تصویرِ جہاں؟

۱۰۱

ایک انگارہ ہے میرا یہ جہانِ بے قیام
دم بہ دم ہے جو اسیرِ انقلابِ صبح و شام
اس کو کر لے گی مکمّل صرف سوہانِ قضا[1]
اس جہاں کا پیکرِ گِل ہے ابھی تک ناتمام

[1] سوہانِ قضا: تقدیر کی ریتی؛

۱۰۲

کس طرح آخر بتا تو اے فلک سیر آفتاب!
ہو گئے اتنا دُور میری آنکھ پر ہے بے نقاب
آدمِ خاکی سے واصل خاکداں سے دُور ہے
جلوۂ مژگاں گسل؎ تو ہے کہاں زیرِ حجاب؟

۱۰۳

اپنے تیشے سے بنا تو اپنی راہِ کامیاب
دُوسروں کی راہ پر ہے گام زن ہونا عذاب
کارِ نادر آشکارا ہو جو تیرے ہاتھ سے
وہ خطا بھی ہو تو بن جاتا ہے اِک کارِ ثواب

؎ جلوۂ مژگاں گسل: پلکوں کو پگھلا دینے والا حسن۔

۱۰۴

راہ گیرِ[1] دل کو نفرت ہر گھڑی منزل سے ہے
وہ سدا آزادِ کامل قیدِ آب و گِل[2] سے ہے

مت سمجھ ناداں کہ دل ہے جسمِ خاکی میں مقیم
یہ ہے دریا جو گریزاں بندشِ ساحل سے ہے

۱۰۵

یاس و حسرت کے اثر سے کیوں ہُوا خلوت گزیں؟
آ۔ نگاہِ شاہدِ فطرت سے حاصل کر یقیں!

اے مسلماں! تجھ کو حق نے دی ہے چشمِ پاکباز
تاکہ اُس کے نور سے پائے نگاہِ پاک بیں!

[1] راہ گیر: مسافر؛ [2] قیدِ آب و گل: دُنیا کی قید؛

۱۰۶

مجھ کو افلاطون و فارابی سے کچھ رشتہ نہیں
میں رہا اس عالمِ ایجاد میں خلوت گزیں
غیر سے مانگی نہیں میں نے نگاہِ مستعار
صرف اپنی آنکھ سے دیکھا جہاں کو بالیقیں

۱۰۷

جس کو دیکھو، ہے خودی کی ابتدا سے بے خبر
اور خودی ہے بے نیازِ بندشِ شام و سحر
خضر سے میں نے سنا یہ نکتۂ حکمت فروز
بحرِ بے پایاں[۱] نہیں ہے موج سے دیرینہ تر

۱؎ اِس مصرع میں بحرِ بے پایاں سے مراد ہے ازل و ابد اور "موج" سے مراد ہے خودی۔ مطلب یہ کہ خودی ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔

۱۰۸

زندگی کی رمز اے دل غنچے میں ہے بے نقاب
یہ حقیقت ہے مجازِ غنچہ ہی سے بے حجاب
گو اُگا وہ خاکِ تیرہ سے مگر رفعت تو دیکھ
اس کی نظروں کا بنی مرکز شعاعِ آفتاب

۱۰۹

ہے خدا کے نُور سے پُر نور بزمِ باغ و راغ[1]
اُس کی صہبا کی تجلّی سے ہے گُل روشن ایاغ[2]
اُس نے تاریکی نہ رہنے دی کسی کی رات میں
ہر کسی کا دل ہے اُس کے داغ سے گویا چراغ

[1] راغ : جنگل ۔ [2] ایاغ : پیالہ ۔

۱۱۰

نرگستاں کی زمیں سے غنچۂ نورس اُگا
خواب کو آنکھوں سے اُس کی اوس نے پھر دھو دیا
اس طرح گویا خودی ہے بے خودی سے آشکار
جس کی خواہش تھی جہاں کو، اس کو آخر پالیا

۱۱۱

یہ جہاں رکھتا نہ تھا اپنے پہ جب کچھ دستگاہ
آرزو کے کوچے میں ڈھونڈا کیا وہ اپنی راہ
چھپتے چھپتے بھاگ نکلا وہ عدم کی گود سے
آخر اس نے آ کے آدم ہی کے دل میں لی پناہ

۱۱۲

میرا دل تو ہو چکا ہے جسم و جاں کا راز داں
مت سمجھ، ہیں موت کی جانکاہیاں مجھ پر گراں
ایک دنیا آنکھ سے اوجھل ہوئی تو غم ہے کیا
اب بھی میری وسعتِ دل میں نہاں ہیں سَو جہاں

۱۱۳

خوب صورت پُھول بھی میری طرح مشکل میں ہے
مبتلا بندِ طلسمِ شورشِ محفل میں ہے
گو زبانِ برگِ گُل میں روحِ گویائی نہیں
اُس کے سینے میں ہے دلؔ اور رنج ہستیٔ دل میں ہے

۱۱۴

جانتا ہوں میں جہاں میں لالۂ خودرو کی خُو
دیکھتا ہوں شاخ کے اندر گلوں کے رنگ و بُو

دوست رکھتا ہے مجھے اس واسطے مرغِ چمن
اس کے نغمے کی سمجھتا ہوں میں رمزِ ہائے وہو [۱]

۱۱۵

یہ جہاں ہے سر بسر اک نغمہ زارِ آرزو
زندگی کے زیر و بم [۲] کا چشمہ تارِ آرزو

حال و استقبال و ماضی کے ہیں جتنے واقعات
ان کا مخزن بالیقیں ہے روزگارِ آرزو

۱؎ رمز ہائے وہو: مستی و بیخودی کا راز ہے۔
۲؎ زیر و بم: نغمے کا پست و بلند۔ یہاں مراد ہے زندگی کا نشیب و فراز ہے۔

۱۱۶

میرا دل رہتا ہے ہر دم بے قرارِ آرزو
سینۂ پُر جوش میں برپا ہے شورِ ہائے وہو
مجھ سے کیا کرتا ہے باتوں کا تقاضا ہمنشیں
میں تو اپنی ذات ہی سے کر رہا ہوں گفتگو

۱۱۷

ہے مرا رازِ بقا دُنیا میں سوزِ ناتمام!
مجھ پہ ہے آرام و راحت صورتِ ماہی حرام!
کر نہ ساحل کی تمنّا کیونکہ اُس کی گود میں
ایک دم کی ہے تڑپ اور بعد ازاں مرگِ دوام!

۱۱۸

برہمن سجدہ جو کرنے کو ہے پیشِ صنم
بات پر اس کی نہ کر واعظ ذرا بھی رنج و غم
اُس خدا نے جس نے کی آدم کی خود صورت گری
حکم قدسی[1] کو دیا کہ بُت[2] کے آگے سر کو خم

۱۱۹

سیکڑوں گو توڑ ڈالے پیکرانِ خوشگوار
پھر بھی ہیں وہ سومناتِ آب و گل میں برقرار
کس طرح افرشتہ و یزداں کو پہنچیں فلسفی
کر سکے اب تک نہ وہ جب آدمی ہی کو شکار!

۱ قدسی : فرشتہ ۔
۲ بُت : مُراد آدم کا پیکرِ خاکی ۔

۱۲۰

آ مرے حاصل سے لے سرمایۂ قلبِ تپاں
میری مشتِ گل سے اُگتے ہیں یہاں کتنے جہاں
منزلِ جاناں کے رستے کی جو ہو تجھ کو تلاش
میرے دل کے دشتِ بے پایاں میں ہو دم بھر نہاں

۱۲۱

بزمِ فطرت میں ہزاروں سال میں بیٹھا رہا
اُس سے رشتہ جوڑ کر اپنے سے میں غافل رہا
ہے یہی مصرع مگر میرے جنوں کی سرگزشت
بُت بنایا، کی پرستش، ٹکڑے ٹکڑے کر دیا

۱۲۲

میرے دِل کے پر نے پائی تھی ازل ہی میں کشود
قلب کو کیوں صید کرتی کارگاہِ ہست و بود[1]
میری قیمت ہے زیادہ تیری نظروں میں فقط
کیونکہ تو نے ہی دکھایا مجھ کو بازارِ وجود

۱۲۳

مرے سینے میں ہے ایسا جلوۂ آوکار کیوں؟
اور یہ دنیا ہے یکسر مخزنِ اسرار کیوں؟
کچھ تو سمجھا مجھ کو بھی تُو اے حکیمِ نکتہ داں
جسم ہے آسودہ کیوں اور جان ہے سیّار[2] کیوں؟

[1] کارگاہِ ہست و بود: مراد دنیا ہے۔ [2] سیّار: چلنے والی، تیز رفتار ہے۔

۱۲۴

نازکرتا ہوں خودی پر، ہوں گدائے بے نیاز
نے نوازی سے مری فطرت کا ہے سوز و گداز
میرے نغموں سے ہے تیرے دل میں حشرِ اضطراب
مَیں [1]سکندر طبع ہوں اور قلب کا آئینہ ساز!

۱۲۵

تُو سمجھتا ہے اگر اپنا مقامِ کیف و کم
اپنی شبنم ہی سے کر تعمیر اک طوفانِ یم[2]
کب تک اے دِل! ہاتھ پھیلائے گا پیشِ ماہتاب
کیوں نہ تیری شب کو روشن کر دے خود تیرا ہی عدم؟

[1] کہتے ہیں کہ آئینہ کا موجد سکندر ہے ؛ [2] یم : سمندر ؛

۱۲۶

غم نہ کر، ہر گز نہیں دل قیدیٔ زنجیرِ دم
مومنوں کا دِل نہیں وابستۂ بود و عدم
حق سے ڈر، مت موت سے ڈر اے ضعیف الاعتقاد
جاوداں ہے دِل تو پھر کیا موت کا رنج و الم؟

۱۲۷

ہاں، بتا اے دِل رہے گا کب تلک میرا ندیم
خلعتِ شاہی سے بہتر ہے کہیں میری گلیم!
کیا رہے گا میرے سینے میں تُو بعدِ مرگ بھی
مَیں ہوں تیرے ہاتھ سے سر گشتۂ اُمید و بیم!

۱؎ ندیم: دوست ۲؎ کلیم: گوڈری

۱۲۸

صوفیوں کو جا کے دو پیغام یہ اقبال کا

اُن کو، جو اللہ جُو ہیں اور معنی آشنا

میں ہوں اُس مردِ خدا کے عزم و ہمّت کا غلام

جو خودی کے نُور سے دیکھے سدا نورِ خدا

۱۲۹

مثلِ نرگس گلشنِ عالم میں نادیدہ[1] نہ ہو

مثلِ بُو غنچوں ہی میں بے سُود پیچیدہ نہ ہو

اے مسلماں! حق نے تجھ کو دیدۂ روشن دیا

عقل میں بیدار ہے تو دل میں خوابیدہ نہ ہو

[1] نادیدہ : نابینا۔ نورِ چشم سے محروم ؛

۱۳۰

اک صنم مَیں نے تراشا عین اپنی شکل کا
اپنی صورت پر بنا ڈالا ہے گویا اک خُدا
اپنے سے باہر ہے میرے واسطے جانا محال
مَیں پرستارِ خودی ہوں، خود پہ ہوں ہر دم فدا

۱۳۱

غنچۂ نورستہ نے اک صبح شبنم سے کہا
میری نظریں گُل چمن تک ہو نہیں سکتیں رسا
عرصۂ عالم پہ طالع ہیں ہزاروں آفتاب
اُس کی وسعت میں بھی جھگڑا ہے بلند و پست کا

۱۳۲

اِس زمیں ہی کو سمجھ تُو رازدارِ آسماں

ہے مکاں تیرا ہی غافل شرحِ رمزِ لامکاں[1]

ذرّہ ذرّہ اُڑ رہا ہے منزلِ محبوب کو

راہ کی جانب ہے تیری رہنما ریگِ رواں[2]

۱۳۳

تو ہی اے مسلم جہاں میں ہے نشانِ بے نشاں[3]

تُو ہی بے شک ہے یہاں مقصودِ حرفِ کُن فکاں

گام زن ہو زندگی کی راہ میں بے خوف و غم

تُو ہے اس کی رُوح، بے تیرے نہیں کچھ بھی جہاں

---

۱ لامکاں: عرشِ الٰہی کا ماحول جس میں کوئی تحدیدِ مکانی نہیں ؛ ۲ ریگِ رواں: صحرا میں اُڑتی ہوئی ریت ؛ ۳ بے نشاں : غائب و غیر مرئی خدا ؛

۱۳۴

یہ زمیں کیا چیز ہے؟ مٹی مرے مے خانے کی!
آسماں کیا شے ہے؟ اک گردش مرے پیمانے کی!

میرے سوز و ساز کی ہے داستاں بے حد طویل
کُل جہاں تمہید ہے گویا مرے افسانے کی!

۱۳۵

مٹ گیا اسکندر اور اُس کے وہ شمشیر و عَلَم
شہر کا باج و خراج اور جملہ گنجِ کان و یم!

اُمّتوں کو جان لے شاہوں سے بھی پائندہ تر
آج بھی زندہ ہے ایراں، مٹ گئی گو شانِ جم[1]!

[1] جم : مخفّف جمشید کا جو بادشاہِ ایران تھا۔

۱۳۶

قلب میرا لے اُڑا تو میرے چاکِ سینہ سے
ہاتھ رنگیں کر لئے میرے زرِ گنجینہ سے
کس کو تُو نے سونپ دی میری متاعِ آرزو
کیا کیا آخر بتا میرے غمِ دیرینہ[۱] سے

۱۳۷

مُجھ سے چھوٹا عشق میں تیرے جہانِ رنگ و بُو
بھُول بیٹھا میں زمین و آسمان و چارسُو
تُو ہی اے دِل اُس کے ہنگاموں سے کرتا ہے گریز؟
یا ترے خلوت کدے سے جا چکا اللہ ھُو؟

[۱] غمِ دیرینہ: عشق و محبت کا پُرانا غم۔

۱۳۸

سازِ کے پردے سے گو یکسر ہوں میں ناآشنا

مجھ پہ ہے لیکن عیاں، کیا زندگی کی ہے نوا

میں نوا پیرا ہوا گلشن میں کچھ اس شان سے

پوچھتا ہے پھول بلبل سے "یہ ہے کس کی صدا؟"

۱۳۹

کر گئی بیدار محفل کو نوا مجھ مست کی

مشتِ گِل پر میں نے مارا ہے شرارِ زندگی

دِل کو میں نے کر دیا پُر نور، نُورِ عقل سے

عقل کے کھوٹے کھرے کی ہے کسوٹی قلب ہی!

۱۴۰

فکر و احساسِ عجم ہے میرے نغموں سے عیاں
ہے متاعِ عشق اس کی میرے سودا[1] سے گراں
دشت میں وہ اک جماعت تھی کہ تھی گم کردہ راہ
اب مری بانگِ درا[2] سے بن چکی ہے کارواں

۱۴۱

یہ مرے نغمے ہیں جن سے ہے عجم آتش بجاں
اور صدا میری بنی آخر درائے کارواں
مثلِ عرفی تیز تر گاتا ہوں میں اپنی حُدی
راہ پیما[3] خواب میں ہے اور ہے محمل گراں

[1] سودا: جنونِ تعمیر و تسخیر؛ [2] بانگِ درا: گھڑیال کی آواز؛ [3] راہ پیما: مسافر؛

۱۴۲

شعلے برساتی رہی ہے میری جانِ بے قرار

سینۂ مشرق میں رکھا ہیں نے قلبِ حق شعار

میرے آہ و نالہ ہی سے گِل ہے اُس کی شعلہ زار

برق ہوں، میں نے گرائے اُس کی طینت میں شرار

۱۴۳

مثلِ بادِ صبح تُو نے مجھ کو آوارہ کیا

پھُول کی مانند میرے دل کو صد پارہ کیا

آنکھ کو میری، جو تھی ظاہر کے جلووں سے بھی دُور

رنگِ باطن پر شہیدِ ذوقِ نظّارہ کیا

۱۴۴

عقلِ انساں ٹاٹ کو دیتی ہے سونے کی جِلا
سنگ بھی اُس کے ہُنر سے رشکِ آئینہ ہُوا
سب سے بالا ہے نوائے شاعرِ جادو نگار
زندگی کے سَم[1] میں وہ لاتی ہے جوہر شہد کا

۱۴۵

مَیں نے شاخِ آرزو کے پالئے ہیں برگ و بار[2]
مجھ کو فطرت نے کیا ہے زندگی کا رازداں
انتقامِ باغباں سے کر حذر ناوک فگن[3]!
مَیں چمن کے واسطے لایا ہوں پیغامِ بہار!

---

[1] سَم: زہر [2] برگ و بار۔ پتے اور پھل [3] ناوک فگن: تیر انداز۔

۱۴۶

میرا جذبہ جو ہے فردوس بریں سے گل رُبا

جب اچھوتا اور نیا مضمون کرتا ہے ادا

کانپتا ہے میرا دِل سینے میں پتے کی طرح

جس کے نازک جسم پر آبیٹھے قطرہ اوس کا

۱۴۷

ہے عجم بھی بالیقیں اک بحرِ ناپیدا کنار

جس میں گوہر ہیں بہت الماس رنگ و آبدار

میں سفینہ ایسے دریا میں نہ ڈالوں گا کبھی

جس کی موجوں میں نہ مخفی ہوں نہنگِ خونخوار

۱۴۸

یہ نہ کہہ ہرگز کہ ہے کارِ جہاں نا استوار
ہے ہماری ہر گھڑی رازِ ابد کی پردہ دار
تھام لے "امروز" کو مضبوط۔ لا اک انقلاب
ہے ابھی "فردا" ضمیرِ دہر ہی میں جلوہ بار

۱۴۹

گو خدایانِ فرنگی سے گریزاں تُو رہا
گنبد و تربت کے آگے پھر بھی سجدے کو جھکا
شرک کی خوگر تری ذہنیت اس درجہ ہوئی
تُو بنا لیتا ہے سنگِ راہ کو مشکل کُشا

۱۵۰

زندگی کے پیرہن کو ہر گھڑی مت چاک کر

چیونٹی کی صورت نہ مسکن ہم کنارِ خاک کر

خاک میں مت ڈھونڈ دانہ، باز کی رفعت دکھا

ہمّت و جرأت دکھا اور قلب کو بے باک کر

۱۵۱

درمیانِ لالہ و گل تو بنا اک آشیاں

مُرغِ نغمہ خواں سے لے گلزار میں درسِ فغاں

ناتوانی سے اگر تُو ہو رہا ہے مردِ پیر

سخت کوشی سے بنا پھر رُوح کو اپنی جواں

۱۵۲

رُوح نے واللہ کی تھی تن کی خود ہی آرزو
جلوے کی خواہش نے کر ڈالا ہے اِس گُل کو دورُو
جانِ مضطر کے ہیں لاکھوں شیوہ ہائے رنگ رنگ
جسم بن جاتی ہے وُہ جب کرلے اک شیوے کی خُو

۱۵۳

کان میں میرے صدا مرقد سے آئی ایک رات
خاک کے نیچے بھی پا سکتے ہو تم عیشِ حیات
سانس رکھتا ہے مگر وہ جاں سے ہے بکسر تہی
غیر ہی کے رحم پر ہے جس کی ہستی اور ممات

۱۵۴

ہو نہ پابوس اِس جہانِ آب و گل سے زینہار
کیوں پریشاں ہے۔ اگر جلوہ ہے یہ ناپائدار
فطرتِ صلح بناتی ہے جہاں پیکر کوئی
اُس کی تکمیلِ عمل کو چاہیے اک روزگار

۱۵۵

ہے جہانِ رنگ و بُو تیرے لئے فہمیدنی[۱]
گلشنِ عالم میں کتنے گُل ابھی ہیں چیدنی[۲]
اپنے باطن پر کبھی تو چشمِ بینا کر نہ بند
تیرے دل میں ہیں بہت اشیائے نادر دیدنی[۳]

۱ـ فہمیدنی: قابلِ غور و فکر۔ ۲ـ چیدنی: چننے کے قابل۔ ۳ـ دیدنی: قابلِ دید۔

۱۵۶

تُو یہ کہتا ہے کہ "میں" ہوں اور نہیں کچھ بھی خُدا

دہر ہے لا انتہا، کوئی نہیں اس سے ورا

میری نظروں سے ابھی تک راز یہ پوشیدہ ہے

یہ جہاں ہے بھی کوئی شئے، یا ہے دھوکا آنکھ کا؟

۱۵۷

میری محفل میں نہ پاؤ گے کبھی مُرغ و کباب

میرے ساغر میں نہیں رقصاں مئے آئینہ تاب

ہے غذا میرے غزالِ عشق کی برگِ گیاہ

تاہم اُس کا خونِ دل ہے گرم جوش و مشکناب

۱۵۸

سوزِ نغمہ سے مرے ہی خونِ مسلم ہے تپاں
اُس کی آنکھوں سے مرے ہی اشکِ مضطر ہیں رواں
محشرِ جذبات سے میرے ہے لیکن بے خبر
میری نظروں سے ابھی اس نے نہیں دیکھا جہاں

۱۵۹

قید ہو سکتا نہیں لفظوں میں صیدِ لامکاں
دیکھ اپنے دل کو، تا یہ راز ہو جائے عیاں
گل بدن پر جان کا چھایا ہے ایسا اقتدار
کہہ نہیں سکتے کہ اِس جا ہے عیاں اُس جا نہاں

۱۶۰

عشق نے ہر قلب کو اک رنگِ تازہ دے دیا
وہ کبھی پتّھر کبھی آئینے سے روکش ہُوا
تجھ کو بیگانہ کیا خود سے تو دے دی چشمِ تر
اور مجھ کو کر دیا مجھ سے زیادہ آشنا

۱۶۱

قیدِ آب و گِل پہ تیری وقفِ حیرانی ہوں مَیں
تو یہ کہتا ہے کہ رومی اور افغانی ہوں مَیں
سب سے پہلے مَیں تو ہوں اک آدمِ بے رنگ و بُو
بعد اس دستور کے ہندی ہوں، تورانی ہوں مَیں

۱۶۲

ذوق و شوقِ شعر سے خوں ہو گیا میرا جگر
اور غبارِ راہ کو اُس نے کیا مشتِ شرر
مَیں نے لب کھولے جو گفتارِ محبّت کے لئے
گفتگو نے رازِ اُلفت کو کیا پوشیدہ تر

۱۶۳

چھوڑ بیٹھا گا جوش میں آخر وہ عقلِ ذو فنوں[1]
کر دیا اُس نے دلِ خود کام کو اُلفت سے خوں
پوچھتا ہے کیا تُو اقبالِ فلک پیما[2] کی بات
وہ حکیمِ نکتہ داں کہتا رہا حرفِ جنوں!

[1] عقلِ ذو فنوں: مکّار اور حیلہ ساز عقل؛ [2] فلک پیما: آسمان پر پرواز کرنے والا؛

افکار

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افکار

پہلا پھول

میں دیکھتا نہیں گلشن میں ہم نفس کوئی
بہار بھی ہے رواں، میں گلِ نخستیں[1] ہوں

میں آبجو میں ابھی خود کا ہوں تماشائی
اسی بہانے سے دیگر گلوں کا رہ بیں[2] ہوں

عیاں ہیں مجھ میں خطِ زندگی کے راز تمام
پیامِ شاہدِ[3] فطرت کا برگِ رنگیں ہوں

فدائے دوش بناتی ہے عبرتِ امروز
شہیدِ جلوۂ فردا ہوں، تازہ آئیں ہوں

اُگا میں خاک سے، پہنی قبائے گُل میں نے
وگرنہ چرخ کا اختر ہوں، ناز پرویں ہوں

۱؎ گلِ نخستیں: پہلا پھول۔ ۲؎ رہ بیں: راستہ دیکھنے والا، منتظر۔ مطلب یہ کہ میں باوجود تنہائی آبِ جو میں اپنا عکس دیکھ دیکھ کر دیگر پھولوں کا منتظر ہوں۔ ۳؎ شاہد: معشوق، یعنی میرے برگِ رنگین پر شاہدِ فطرت نے اپنا پیغام تحریر کر کے بھیجا ہے۔

دُعا

اے کہ تُو نے کر دیا خمخانۂ فطرت سے مست
آتشِ صہبا[1] سے کر دے میری مینا کو گداز

عشق کو کر زندہ میری گرمیِ فریاد سے
شعلۂ سینا[2] کا پھر دل میں بپا کر سوز و ساز

بعد مرنے کے مری گِل سے عیاں کر لالہ زار
اور صحرا[3] میں مرے داغوں سے کر روشن شرار

ہلالِ عید

دوڑے گا چشمِ شوق سے کیونکر تُو اے ہلال
ہر آنکھ راستے میں ترے ایک دام ہے

خود ہی کو دیکھ، کر نہ تہی دامنی کا غم
مخفی ترے ہی سینے میں ماہِ[4] تمام ہے

۱؎ آتشِ صہبا: سوزِ شراب۔ اس سے مراد ہے شرابِ عشق۔ ۲؎ سینا: کوہِ طور۔ "شعلہ سینا" سے مراد ہے وہ آگ جو حضرت موسیٰؑ نے طور کے دامن میں دیکھی تھی۔ ۳؎ "صحرا" ایک استعارہ ہے جس سے مراد ہے، قلبِ مسلم کی بنجر زمین۔ ۴؎ چونکہ ہلال ہی بڑھتے بڑھتے بالآخر ماہِ کامل بن جاتا ہے، لہٰذا فرمایا ع

در سینۂ تو ماہِ تمامے نہادہ اند

تسخیرِ فطرت

(۱) میلادِ آدم

عشق للکارا کہ پیدا ہو گیا خونیں جگر
حُسن کانپا، آ گیا منظر پہ اک صاحب نظر

بولی گھبرا کر یہ فطرت "عالمِ مجبور میں
اُس کو دیکھو جو ہے خودگر، خودشکن اور خودنگر"

یہ خبر گردوں سے سُن بیٹھا شبستانِ ازل[۱]
پردہ دارو! الحذر! اب آ گیا ہے پردہ در[۲]

آرزو آغوشِ ہستی میں تھی گویا مستِ خواب
آنکھ جب کھولی تو دیکھی ایک دنیائے دگر

زندگی بولی کہ میں صدیوں رہی ہوں مضطرب
بعدِ مدت گنبدِ گرداں[۳] میں دیکھا ایک در

(۲) انکارِ ابلیس

سجدہ آدم کو کروں؟ میں نوری، ناداں نہیں
وہ اگر ہے خاک سے تو اصل میں آذر[۴] ہوں میں

سوز سے میرے تپاں ہے خونِ جسمِ کائنات
صرصر اور طوفاں ہوں میں، رعد ہوں، تندر ہوں میں

---

[۱] "ازل" کو شبستاں اس بنا پر کہا کہ اس وقت تمام اشیائے کائنات ابھی تاریکیٔ عدم میں تھیں۔ [۲] پردہ در: پردہ چاک کر دینے والا، رازہائے ازل کو بے نقاب کرنے والا۔ اسی بنا پر ایک اردو شعر میں فرمایا ہے

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

[۳] گنبدِ گرداں: چکر کھانے والا گنبد، مراد آسمان۔ [۴] آذر: آتش ہوں

مجھ کو فطرت نے عناصر کا بنایا سوز و ساز — دہر کے میخانے میں اک دستِ میناگر ہوں میں
اپنی مصنوعات کو کرتا ہوں خود ہی پاش پاش — توڑ کر کہنہ کو نقشِ نو کا صورت گر ہوں میں
میرے طوفاں ہی کا اک موجہ ہے چرخِ بے سکوں — نقش سازِ دہر ہوں، تاب و تبِ جوہر ہوں میں
خالقِ انجم ہے تو، انجم میں پھونکی میں نے روح — دو جہاں کے جسم کی اک قوتِ مضمر ہوں میں
تو بدن میں جان اور میں جان میں دیتا ہوں شعور — تو سکوں سے راہزن ہے، سوز سے رہبر ہوں میں
تنگ ظرفوں سے کبھی میں نے نہیں مانگے سجود — قاہرِ بے نار ہوں، مولائے بے محشر ہوں میں

آدمِ بے ذوق تیرے ہاتھ میں پیدا ہوا
گود میں میری مگر ہوگا وہ پیرِ بے نوا

(۳) اغوائے آدم

(شیطان آدم کو گمراہ کرتا ہے)

سوز و سازِ زندگی ہے اصل میں عیشِ دوام — فاختہ بھی باز ہو سکتی ہے لیکن زیرِ دام
تو ہے سجدوں پر فدا، سجدے غلامی کا نشاں — سروِ سرکش ہو کے رہ اے سروِ جانِ نرم گام
کوثر و تسنیم تجھ سے چھین لیں گے جوشِ کار — تاک[۱] کے مینا سے پی لے بادۂ آئینہ فام[۲]

۱ تاک: انگور کی بیل۔ ۲ بادۂ آئینہ فام: صاف و شفاف شراب۔

خیر و شر ہے بے خبر وہمِ الٰہی کا فریب
پیروِ لذّات ہونے سے ہے انساں شادکام

آ تجھے مَیں عالمِ نَو کے دکھاؤں معجزات
کھول آنکھیں اور کر فردوسِ ارضی میں خرام

قطرہ بے مایہ ہے تُو، گوہرِ تابندہ ہو!
چرخ سے نیچے اُتر، دریا میں کر جا کر قیام

تیغِ رخشندہ[1] ہے تُو، جانِ جہاں کا خون کر
جوہرِ بُرّاں دکھا، عالم پہ ہو جا بے نیام

مثلِ شاہیں قمری و کنجشک[2] پر ہو حملہ ور
ہے پیامِ مرگ شاہیں کے لئے کنجِ کنام[3]

وصل ہے محبوب کا جذبات کا فوری زوال
زندگی کا راز کیا ہے؟ آرزوئے ناتمام

(۴) جذباتِ آدم

(آدم بہشت سے باہر آ کر نغمہ سرا ہوتا ہے)

اب بتا دوں گا مَیں ہستی کو سراپا سوز و ساز
قلبِ کوہ و دشت کو مَیں دم سے کر دوں گا گداز

مَیں قفس[4] کو توڑ کر جاتا ہوں سوئے گلستاں
دردِ ہجرِ یار کا انجم سے کہہ ڈالوں گا راز

---

[1] تیغِ رخشندہ: چمکنے والی تلوار۔ [2] کنجشک: چڑیا۔ [3] کنام: باز کے رہنے کی جگہ
[4] قفس: پنجرہ، مراد قیدِ فلک۔ اسی مصرع میں "گلستاں" سے مراد ہے عالمِ سفلی ۱۲

آرزو کے بحر میں ہے عجز کا طوفاں بپا

اب حقیقی لطف دے گا پیکرِ جاناں کا راز

گاہ اُس جا پھول ہی معلوم ہو گا لالہ زار

اور کبھی خاروں سے پیدا ہو گا گُل کا امتیاز

مَیں ہوں سوزِ ناتمام و رہنِ دردِ آرزو

شک یہاں بہتر یقیں سے، ہوں شہیدِ جستجو!

(۵)۔ صبحِ قیامت

(آدم بارگاہِ الٰہی میں)

اے کہ تیرے مہر سے ہے کوکبِ جاں مستنیر[1]
تو نے روشن کی مجھی سے دہر کی چشمِ ضریر[2]

میرے اعجازِ ہنر سے بحر بھی اک نائے آب[3]
میرے تیشے نے بہائی سنگ سے بھی جوئے شیر

زہرہ و شمس و قمر میرا ہی کرتے تھے طواف
عقل میری ہر دو عالم میں تھی محوِ دار و گیر

میں ہی تھا زیرِ زمیں، اور میں ہی تھا بالائے چرخ
میرے جادو کے تھے قیدی ذرّہ و مہرِ منیر!

---

[1] مستنیر: روشن، پُر نور۔ [2] چشمِ ضریر: اندھی آنکھ۔ [3] نائے آب: چھوٹی سی ندی۔

گو فسونِ دہر[2] نے مجھ کو بھلا دی راہِ حق
در گزر کر مجھ سے، تیری ذات ہے توبہ پذیر

بہرِ تسخیرِ جہاں ہی اُس کے کھائے ہیں فریب[3]
حُسن کو بے عشق ہرگز کر نہیں سکتے اسیر

میری آہوں سے ہو تا دُنیا کا بُت خانہ گداز
باندھنا زنّار[4] کا بھی ہو گیا تھا ناگزیر

عقل کرتی ہے مقیّد فطرتِ چالاک کو
اب تو سجدہ کر رہا ہے اہرمن[1] بھی خاک کو

بوئے گُل

بے چین ہو کے حُور نے جنّت میں یہ کہا
معلوم حیف مجھ کو نہ حالِ زمیں ہُوا

بالا ہے فہم سے سحر و شام و روز و شب
عُقدہ عجیب سا ہے یہ موت و حیات کا

نکہت کی موج بن کے وہ گُل میں سما گئی
عالم میں ظاہر اپنے کو اس طرح کر دیا

کھولی جو آنکھ غنچہ بنی پھر ذرا ہنسی
گُل بن کے ٹوٹی اور زمیں پر قدم پڑا

---

۱ اہرمن: شیطان۔ ۲ فسونِ دہر: عجائباتِ عالم کا جادو۔ ۳ یعنی شیطان کے دھوکے بھی کھائے تو اس لئے کہ زیادہ محتاط و تجربہ کار ہو کر عناصرِ جہاں کو مسخر کر لوں۔ ۴ زنّار: جنیئو، جو علامتِ کفر ہے۔ یعنی میں کفر کے ماحول میں بھی رہا تو اس بنا پر کہ بُت خانۂ عالم کے صنم پاش پاش کر دوں۔

اُس نازنیں سے، جس کو تھی دُنیا کی آرزو
اک آہِ یادگار ہے کہتے ہیں جس کو "بُو!"

نوائے وقت

خورشید بہ داماں ہوں، انجم بہ گریباں ہوں
گو کچھ بھی نہیں، پھر بھی میں تیرے لئے جاں ہوں

میں رُوحِ بیاباں ہوں، میں نُورِ شبستاں ہوں
میں درد ہوں درماں ہوں، میں عیشِ فراواں ہوں

میں تیغِ جہاں افگن، میں چشمۂ حیواں ہوں

ذرّات ہیں میرے ہی تیموری و چنگیزی
اور میرا اشارہ ہے ہنگامۂ افرنگی

ہے نقش مرا انساں اور اُس کی یہ دنیا بھی
زینت مرے گلشن کی خونِ جگرِ غازی

میں آتشِ سوزاں ہوں، میں روضۂ رضواں[1] ہوں

ساکن بھی رواں بھی ہوں یہ طرفہ تماشا دیکھ
امروز کی صہبا میں کیفیتِ فردا دیکھ

[1] روضۂ رضواں: باغِ بہشت ۔ روضہ بمعنی باغ اور رضواں بمعنی داروغۂ جنّت ؛

پوشیدہ مرے دل میں صد عالمِ رعنا دیکھ — صد کوکبِ رخشاں[1] دیکھ، صد گنبدِ خضرا[2] دیکھ

میں پوششِ انساں ہوں، پیراہنِ یزداں ہوں

تقدیرِ فسوں میرا، تدبیرِ فسوں تیرا — تو عاشقِ لیلیٰ ہے، میں دشتِ جنوں تیرا
تو رازِ دروں میرا، میں رازِ دروں تیرا — میں پاک ہوں، بے صرفہ ہے چند و چگوں[3] تیرا

ہوں دل سے ترے پیدا، اور دل ہی میں پنہاں ہوں

میں راہ ہوں تو منزل، میں کھیت ہوں تو حاصل — تو سازِ ترنم زا، تجھ سے ہے سجی محفل
اے تودۂ آب و گل[4]! کچھ دیکھ مقامِ دل — اک جام میں سمٹا ہے یہ قلزمِ[5] بے ساحل

تو موج ہے میں طوفاں، میں تجھ سے تو رقصاں ہوں

۱؎ کوکبِ رخشاں: روشن ستارہ۔ ۲؎ گنبدِ خضرا، سبز گنبد۔ مراد آسمان۔ ۳؎ چند و چگوں: خیال و وہم، غور و فکر، سوچ بچار۔ ۴؎ "تودۂ آب و گل" سے مراد ہے انسانِ خاکی۔ ۵؎ قلزمِ بے ساحل: غیر محدود سمندر۔ یعنی قلبِ انسانی بظاہر گو ایک جام کی وسعت بھی نہیں رکھتا لیکن وقت کا بحرِ ناپیدا کنار اس میں مستغرق ہو رہا ہے۔

فصلِ بہار

(۱)

اُٹھو، ہے کوہ و دشت میں ابرِ بہاری خیمہ زن
اب مست نغمہ ہے ہزار[۱]
اور طوطی و درّاج[۲] و سار
رقصاں کنار جوئبار
صحرا کے گُل اور لالہ زار
سب ہو گئے رنگیں عذار[۳]
ہاں، دیکھ لو فیضِ بہار!
اُٹھو، ہے کوہ و دشت میں ابرِ بہاری خیمہ زن

(۲)

جاگو کہ باغ و راغ[۴] میں آیا ہے گُل کا قافلہ

---

۱ ہزار: بلبل ۲ درّاج: تیتر۔ ۳ عذار: رخسار ۴ راغ: جنگل ؛

آئی بہاروں کی ہوا
مرغِ چمن مستِ نوا
اب چپ لگی لالے نے کیا
ہر بند اپنے جامے کا
لو، حُسن لایا گُل نیا
ہے عشق ہیں غم کی ادا
جاگو کہ باغ و راغ[1] میں آیا ہے گُل کا قافلہ

(۳)

نغمہ سرا ہیں بلبلیں، رنگیں نوا ہیں قمریاں
خُونِ چمن ہے گرم جوش
بیٹھے ہو پھر کیوں تم خموش
ہاں، توڑ دو آئینِ ہوش
ہو جاؤ گرم نائے[2] و نوش

[1] راغ : جنگل [2] نائے و نوش : موسیقی اور مے کشی ۔

برپا ہو نغموں کا خروش
بن جاؤ یکسر لالہ پوش!
نغمہ سرا ہیں بلبلیں، رنگیں نوا ہیں قمریاں

(۴)

حجرا نشینی چھوڑ دو، صحرا میں جھنڈے گاڑ لو!
بزمِ گل و مُل[1] میں رہو
آبِ رواں کا لطف لو
نرگس کے دیکھو ناز کو
ماتھے پہ اُس کے بوسہ دو
شاداں رہو، رقصاں رہو
جب تک ہو، فرحت سے جیو!
حجرا نشینی چھوڑ دو صحرا میں جھنڈے گاڑ لو

(۵)

تو ہے عیاں سے بے خبر چشم دروں سے کر نظر

[1] مُل : شراب

پُر گُل سے ہیں کوہ و کمر[1]
اور لالہ ہے آتش بہ بر[2]
تر کرتی ہے اُس کا جگر
جب شبنمِ اشکِ سحر
گویا شفق کے طشت پر
انجم کے ہیں رخشاں گہر
تُو ہے عیاں سے بے خبر چشمِ دروں سے کر نظر

(۶)

خاکِ چمن سے ہے عیاں گنجِ درونِ کائنات
یہ عقدۂ ذات و صفات
انسانِ بے کس کی برات
تم جس کو سمجھے ہو حیات
اور جس کو کہتے ہو ممات

[1] کمر: وادیٔ کوہ۔ [2] بر: آغوش یعنی بہار میں لالہ نے بھی آغوش میں آتش بپا کر رکھی ہے۔

یعنی طلسمِ شش جہات
ہے عارضی اور بے ثبات
خاکِ چمن سے ہے عیاں گنجِ درونِ کائنات

حیاتِ جاوید

نہ کہہ کہ ختم ہُوا فیض و لطفِ ساقی کا
ہزار بادہ سے معمور ہے ابھی رگِ تاک[۱]

حسین ہے باغ مگر اس میں رہ نہ غنچہ صفت
قبا ہے جس کی فقط موجۂ صبا سے چاک

اگر تُو واقفِ رمزِ حیات ہے، تو نہ لے
وہ دِل کہ ہے خلشِ خارِ آرزو[۲] سے پاک

مثالِ کوہ جہاں میں قوی و محکم رہ
نہ رہ تو خس کی طرح، کیونکہ شعلہ ہے بے باک

---

[۱] تاک: انگور کی بیل۔ [۲] اقبالؒ کے نزدیک جذبۂ آرزو ہی ایک کامیاب و مستقل زندگی کی بہترین علامت ہے۔ مثلاً ؎

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی (بالِ جبریل)

افکارِ انجم

(۱)

ایک تارا دوسرے تارے سے بولا با ملال
ہم ہیں ایسے بحر میں جس کا کوئی ساحل نہیں
فطرتِ انجم میں ہے روزِ ازل ہی سے سفر
آہ اپنے کارواں کی کوئی بھی منزل نہیں

(۲)

ہستیٔ انجم ہی کیا جب لرزہ براندام ہوں
کہنہ تابی میں نظر آتا ہے کوئی شود
ہم ہیں ہر لمحہ گرفتارِ کمندِ روزگار
خوش نصیب و خوش نوا ہیں جو ہیں محرومِ وجود

(۳)

اور کوئی بھی اُٹھا سکتا نہ یہ بارِ گراں[1]
بُود سے اپنی تو بہتر تھی نبودِ جاوداں
یہ فضائے نیلگوں ہم کو نہیں ہرگز پسند
اس بلندی سے تو بہتر ہے نشیبِ خاکداں[2]

[1] بارِ گراں: یعنی ہستی اور فرائضِ ہستی کی ذمہ داری۔ [2] خاکداں: مرادِ عالمِ سفلی۔

(۴)

رشک کے قابل ہے انسانوں کی جانِ بیقرار — ہر گھڑی ہے وہ سوارِ راہوارِ روزگار[۱]
قامتِ انساں پہ زیبا ہے قبائے زندگی — سخت کوشی سے ہے وہ نو آفریں[۲] و تازہ کار

زندگی

ایک شب ابرِ بہاری رو کے یہ کہنے لگا — مطلبِ ہستی ہے اس جا گریۂ لاانتہا
تیز رو بجلی چمک کر اُس سے یہ کہنے لگی — تُو غلط کہتا ہے ہستی خندہ ہے اک لمحہ کا

باغ میں کس نے خدا جانے یہ پہنچا دی خبر
درمیانِ شبنم و گُل ایک جھگڑا[۳] ہے بپا

---

۱ راہوارِ روزگار: زمانے کا گھوڑا۔ ۲ نو آفریں: تازہ بتازہ چیزیں تخلیق کرنے والا۔
۳ جھگڑا اس موضوع پر کہ ہستی باعثِ خندہ ہے یا وجہِ گریہ۔ اس مصرع میں "شبنم" کا لفظ گریہ وغم کا ترجمان ہے۔ اور "گُل" کا لفظ خندہ وشادمانی کا۔

گفتگو مابینِ علم و عشق

علم

میری نظریں ہیں جہاں میں رازدارِ ہفت چرخ
اور پھندے میں مرے محبوس[1] جملہ روزگار

جب نہیں ہی پر مری آنکھیں جہاں بیں ہوگئیں
آسماں کا راز پا لینے کو ہوں کیوں بیقرار

میرے سازِ قلب سے ہیں سیکڑوں نغمے رواں
راز اپنے چشمِ عالم پر میں کردوں گا عیاں

عشق

آج دریا تیرے افسوں سے ہوئے ہیں شعلہ زار
اور فضائیں بھی بنیں آتش گداز و زہردار

دوست تھا جب تک تو میرا، نور تھا تیرا وجود
کٹ گیا مجھ سے تو تیرا نور بھی گویا ہے نار

گو تو خلوت خانۂ لاہوت[2] میں پیدا ہوا
پنجۂ ابلیس میں لیکن مقید ہو گیا

[1] محبوس: مقید۔ [2] لاہوت: ذات باری تعالیٰ کا ماحول - عالمِ تجلیات۔

راہِ حق پر آ، بنا اس خاکداں[1] کو گلستاں
اس جہانِ پیر کو اک بار پھر کر دے جواں

میرے دردِ دل سے لے کر ایک ذرّہ مستعار[2]
دہرِ فانی میں بنا لے پھر بہشتِ جاوداں

روزِ اوّل ہی سے غافل محرم و ہمدم ہیں ہم
ایک نغمہ تھا، اُسی نغمے کے زیر و بم ہیں ہم

سرودِ انجم

زیست ہماری ہے نظام
کیف ہمارا ہے خرام
یہ جو ہے دَورِ بے مقام
ہے یہی ہستیٔ دوام

دَورِ فلک سے شادکام دیکھتے ہیں رواں بھی ہیں!

۱ـ خاکداں : مراد دُنیا، عالمِ سفلی ۔ ۲ـ مستعار : اُدھار مانگی ہوئی چیز

جلوہ گہِ شہود[1] کو

بُت کدۂ نمود کو

رزمِ نبود و بود کو

کش مکشِ وجود کو

عالمِ دیر و زود کو، دیکھتے ہیں رواں بھی ہیں!

گرمیٔ کارزار[2] کو

خامیٔ پختہ کار کو

تاج و سریر[3] و دار کو

خواریٔ شہریار کو

بازیٔ[4] روزگار کو، دیکھتے ہیں رواں بھی ہیں!

خواجہ[5] کی سروری گئی

بندہ کی چاکری گئی

---

۱ جلوہ گہِ شہود: مادی دنیا۔ ۲ کارزار: جنگ۔ ۳ سریر: تخت

۴ بازاریٔ روزگار: انقلاب زمانہ۔ ۵ خواجہ: سرمایہ دار ؎

زاری و قیصری گئی

رسمِ[1] سکندری گئی

رونقِ بُت گری گئی ، دیکھتے ہیں رواں بھی ہیں!

خاکِ[2] خموش میں ہے جوش

ہیچ ہے ۔ پھر بھی سخت کوش!

ہے کبھی غرقِ نائے و نوش

غم سے کبھی سیاہ پوش

میرِ جہان و سفتہ گوش[3] ! دیکھتے ہیں رواں بھی ہیں!

تُو ہے ہلاکِ چون و چند[4]

عقل کی یہ کشاد و بند

جیسے ہرن پہ ہے کمند

جو ہے ضعیف و دردمند

۱؎ رسمِ سکندری: شہنشاہیت ، استبداد۔ ۲؎ خاکِ خموش: مراد انسان۔ ۳؎ سفتہ گوش: جس کے کان میں سوراخ ہو۔ یہ قدیم الایام سے ایک علامتِ غلام ہے "میرِ جہان و سفتہ گوش" یعنی مقامِ تعجب ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر بھی غلام ہو۔ ۴؎ چون و چند: کیسا اور کتنا ۔ مراد دُنیا کی بحث مقدار و کیفیت۔

قصر ہمارا ہے بلند، دیکھتے ہیں رواں بھی ہیں!

پردہ ہے کیا، ظہور کیا؟
کیا ہے اندھیرا، نُور کیا؟
چشم و دلِ شعور کیا؟
فطرتِ ناصبور کیا؟
عقدۂ نزد و دُور[1] کیا؟ دیکھتے ہیں رواں بھی ہیں!

تیرا "بہت" یہاں ہے "کم"!
سال ترا ہمارا دم!
سینے میں تیرے گو ہے یم[2]
دل میں ہے بیش و کم کا غم!
ہم کو نہیں کوئی الم، دیکھتے ہیں رواں بھی ہیں!

رہتے اگرچہ ہیں جُدا
پختہ ہے رشتۂ وفا
اُنس و وفا میں ہے بقا
اِس کا نصیر[3] ہے خدا
ہم کو تُمہارے بھلے سے کیا، دیکھتے ہیں رواں بھی ہیں!

[1] نزد و دُور: "مکان" کی بحث جو مومن کی روحِ دوام سے بہت پست تر شے ہے۔ [2] یم: سمندر۔ [3] نصیر: مددگار

نسیمِ صبح

مَیں سمندر اور کوہستاں سے ہوں ہر دم رواں
کیا خبر کس چیز نے مجھ کو کیا ہے یوں دواں
غمزدہ طائر کو دیتی ہوں مَیں پیغامِ بہار
اُس پہ کر دیتی ہوں سیمِ یاسمن[1] کو مَیں نثار
شاخِ لالہ اور سبزے سے ہوں پیہم کھیلتی
تا چمن سے ہو نمایاں رنگ و بوئے زندگی
تا مری گردش سے پیدا ہو نہ اُن میں کوئی خم
ہوں سدا بزمِ گُلاں میں نرم خیز و سست دم
مائلِ نغمہ ہو جب اک شاعرِ رنگیں نوا
اُس کے سوزِ نغمہ میں کرتی ہوں مَیں خود کو فنا

[1] سیمِ یاسمن: یاسمن کی چاندی۔ یاسمن کو چاندی سے اس بنا پر تشبیہ دی کہ وہ بالکل سفید رنگ کا پھول ہے۔

باز کی نصیحت اپنے بچّے کو

پسر! ہم غیور و بلند اصل ہیں — جسور[1] و قوی و نکونسل[2] ہیں
خدا نے بنایا ہمیں شیر دل — حوادث سے ہوتے نہیں مضمحل
نکو کار ہو، پختہ تدبیر ہو — غیور و جسور و کلاں گیر[3] ہو
تو گو کبک[4] و قمری سے ہر دم فرا — مگر جب ترا مدّعا ہو شکار
پرندے وہ ہیں بزدل و ترسناک[5] — وہ کرتے ہیں مٹّی سے منقار[6] پاک
وہ شاہیں ہے نخچیر[7] نخچیر خویش — سکھائے جسے صید آئین و کیش
گرے ہیں بہت باز بر روئے خاک — ہوئے صحبتِ دانہ چیں[8] سے ہلاک
نگہ دار و خود دار و خورسند جی — دلیر و درشت و تنومند جی
تنِ نرم ہے حصّہ بلبلاں — تو فولاد کی مثل ہو سخت جاں
نصیبِ جہاں جو بھی ہے خرّمی — وہ ہے حاصلِ محنت و پُردمی

---

[1] جسور: دلیر، جری۔ [2] نکونسل: عالی خاندان۔ [3] کلاں گیر: بڑے بڑے شکار کرنے والا۔ [4] کبک: چکور
[5] ترسناک: خوف کھانے والا، بزدل۔ [6] منقار: چونچ۔ [7] نخچیر: شکار۔ [8] دانہ چیں: زمین سے دانہ چگنے والے پرندے

یہ کہتا تھا فرزند سے اک عقاب
کہ یک قطرہ خوں بہتر از لعلِ ناب

جہاں تک ہو، خلوت کی کر جستجو
کہ ایسی تھی تیرے بزرگوں کی خو

جسارت[۱] ہے جلوت ہی سے سینہ ریش
کہ ہے انجمن دینِ آہو و میش[۲]

یہ کہتے چلے آئے بازانِ پیر
نہ ہو تو کسی شاخ کا دستگیر

ہمارا نشیمن نہیں باغ و کشت[۳]
کہ ہیں کوہ و صحرا ہماری بہشت

ہمیں وسعتِ چرخ دے جب خدا
تو ہے خاک سے دانہ چُگنا بُرا

جو شاہیں کہ رکھّے قدم خاک پر
وہ مُرغِ سرا سے بھی ہے سُفلہ تر

ہے شایانِ شاہیں فقط فرشِ سنگ
کہ ہم لوگ ہیں سنگ سے تیز چنگ

پرندوں میں تجھ سا نہیں ہے جواں
جہاں میں ہے یکتا ترا خانداں

تو ایسا جری ہے کہ ہنگامِ جنگ
کرے چونچ سے کورِ چشمِ پلنگ

پروں میں ہیں تیرے رفعتِ نُوریاں[۴]
رگوں میں ہیں تیری خونِ کافوریاں[۵]

تہِ چرخِ گرداں، جو ہے گوژ پشت
جو چاہے تو کھا، نرم ہو یا درشت

---

۱ جسارت: جرأت۔ ۲ آہو و میش: ہرن اور بھیڑ۔ ۳ کِشت: کھیتی۔
۴ نوریاں: فرشتے ۵ کافوریاں: اعلیٰ نسل کے باز۔

مگر غیر کا صید ہرگز نہ کھا
کہ غیرت کو ہے وہ پیامِ فنا

تو رکھ دل میں محفوظ نیکوں کی پند
خودی ہے اطاعت ہی سے ارجمند

کِرمِ کتابی

میں نے سُن پایا، کتب خانے میں میرے ایک رات
ایک پروانے سے یہ کِرمِ کتابی نے کہا

میں رہا اوراقِ سینا[1] میں بہت مدت مکیں
فارابی کی کتابیں بھی بہت دیکھا کیا

لیکن اب تک زندگی کے راز ہیں مجھ سے نہاں
تیرہ و تاریک ہے اب بھی دماغ و دل مرا

بولا پروانہ رہے تُو تا ابد تحقیق میں
پھر بھی پائے گا کتابوں میں نہ مقصد زیست کا

ہے تپش سے خونِ ہستی گرم تر اور تیز تر
سوزِ باطن سے سمندِ زندگی ہے برق پا[2]

---

[1] سینا: حکیم بوعلی سینا
[2] برق پا: تیز رفتار

کبر و ناز

ایک دن ندی سے یوں کہنے لگا اِک پہاڑ
تیرے پانی سے ہُوا ہے تلخ میرا روزگار

آئے دن ہوتی ہے تو گستاخ تر بیباک تر
شوخ و آوارہ ہے پہلے سے بھی تیرا راہوار[1]

تو ہمارے خاندانِ کوہ کے لائق نہیں
کہ نہ اپنے آپ کو آزاد دُختِ[2] کوہسار

خاک کو جا چاٹتی ہے ٹھوکریں کھانے کے بعد
چھوڑ دے یہ رہگزر، جا کھیل سوئے مرغزار[3]

بولی ندی بول مت الفاظ ایسے دل شکن
کر نہ اتنا ناز اور ہو جا نہ ایسا بے مہار

مَیں تو نالائق ہوں اور ہوں کوہ سے تیرے دواں
دیکھ! سورج تجھ کو کر ڈالے نہ اک آبِ رواں!

---

[1] راہوار: گھوڑا۔ [2] دخت: مخفف دختر کا بیٹی۔ [3] مرغزار: چراگاہ۔

لالہ

ہیں ازل سے عشق کا وہ شعلۂ جوالہ ہوں[1] بلبل و پروانہ سے پہلے جو تھا صاحب جنوں
مہر سے برتر ہوں میں، ہر ذرے میں ہوں بقرار آسماں نے تاب سے میری کئے پیدا شرار
میں رہا گلزار کے سینے میں صورت سانس کی میری مٹی سے جو نازک شاخ نے پائی نمی
وہ یہ بولی رہ مری آغوش میں اے جاں فزا میرا زخمی دل مگر محرم راحت ہو گیا
تنگنائے شاخ میں میں نے جو کھائے پیچ و تاب جلوہ گاہِ رنگ و بو[2] میں ہو گیا میں بے حجاب
میرے آگے اوس نے برسائے گوہر پُر ضیا صبح ہنس دی اور رقصاں ہو گئی بادِ صبا
گُل نے لیکن کہہ دیا بُلبل سے ہو کر پُر ملال اس کا رنگ و سوز بھی ہو جائے گا نذرِ زوال
اہلِ گُلشن سے کہا بلبل نے ہو کر نوحہ خواں جامۂ ہستی خریدا لالہ نے بے حد گراں
کھول کر سینے کو میں لیتا ہوں احساس مہر کا تاکہ پھر ہو نارِ اُلفت سے مرا دل شعلہ زا

گو ہوا ہوں چار دن کو اس جہاں میں آشکار
سوز ہے میرا چمن کے واسطے سازِ بہار

[1] شعلۂ جوالہ: چکر لگانے والا شعلہ۔ [2] جلوہ گاہِ رنگ و بو: مراد گلشنِ عالم۔

حکمت و شعر

بو علی مغفود ہے یکسر غبارِ ناقہ میں
دستِ رومی نے مگر اُلٹی ہے محمل سے نقاب

یہ گیا تہ تک تو لایا گوہرِ مقصود کو
قید ہے گرداب میں وہ مثلِ خس بالائے آب

حق اگر ہو سوز سے عاری، اُسے "حکمت" کہو
قلب سے جب سوز پا لے، حق ہے گویا شعرِ ناب

کرمکِ شب تاب

ذرۂ بے مایہ نے کی خود میں پیدا وہ جلا
اُس میں جذبہ آگیا قربانیٔ پروانہ کا
شب کو روشن کر دیا

ا۔ حکیم بو علی سینا جس کی رسائی فقط فلسفیانہ نظریات ہی تک تھی، لہذا غبارِ ناقہ ہی میں ناپید ہو کر رہ گیا۔

۲۔ مولانا جلال الدین رومی صاحبِ عشق و معرفت تھے، لہذا محبوبِ حقیقی تک نظر دوڑائی اور اسرارِ ہستی کو کماحقہٗ منکشف کیا۔

یہ کرن تھی جو سمٹ کر بن گئی گویا شرر
سوزِ ہستی نے عطا کی اُس کو آخر شانِ زر
مِل گئی اُس کو نظر

دہر میں پروانۂ بے تاب تھا ہر سُو رواں
شمع پر ایسا جلا، خود بن گیا اک شمعِ جاں
ہو گیا ہم سے دواں[1]

یہ کوئی اختر ہے یا ہے رُوحِ جسمِ ماہتاب
دیکھنے آئی ہے جو اِس خاک کا رنگِ شباب
چھوڑ کر چرخِ خراب

یا ہے اک ماہِ تنک ضو، دم میں جو ہو گا تمام
جس پہ نُورِ مہر کا احسان ہے یکسر حرام
اور ہے آزادِ مقام

[1] دواں: دوڑنے والا، گریزپا۔

کرمکِ شب تاب! تُو ہے پیکرِ نُور و سرور
ہیں تری پرواز ہی میں معنئ غیب و حضور[1]
یہ ہے آئینِ ظہور

تُو اندھیری رات میں ہے مشعلِ مرغانِ شب
کونسا وہ سوز ہے جس سے ہے وقفِ تاب و تب؟
اور ہے گرمِ طلب!

ہے ہماری اصل بھی تیری طرح یہ خاکداں
خواب و بیداری میں دِل اپنا رہا دائم تپاں[2]
پھر نہ پایا رازداں!

ہے سخن میرا عمیق[3] و محکم و صاحب اثر
رکھ نہ منزل کی تمنّا، رہ سدا مستِ سفر
اِس ضیا پر رکھ نظر

۱؎ جگنو کے وجود سے معنئ غیب و حضور اس بنا پر عیاں ہوئے کہ اُس کی روشنی کبھی ظاہر ہوجاتی ہے اور کبھی غائب۔ ۲؎ تپاں: مضطرب، بے چین۔ ۳؎ عمیق: گہرا، معانی سے معمور۔

حقیقت

دشت میں اک دن کبوتر سے لگا کہنے عقاب — دیکھتا ہوں جو بھی شے دنیا میں، ہے یکسر سراب

مُرغِ حق اندیش[۱] نے ہنس کر دیا اُس کو جواب — تُو نے دیکھا ہے سراب اور مَیں نے پایا اُس کو آب!

قعرِ دریا سے یہ سُن کر ایک مچھلی نے کہا

آب کیا ہے؟ موج[۲] ہے، جو کھا رہی ہے پیچ و تاب!

حُدی

(نغمۂ سارباانِ حجاز)

تُو ہی میرا ناقۂ سیّار[۳] ہے

تُو ہی میرا آہوئے تاتار ہے

---

۱ کبوتر کو مرغِ حق اندیش اس بنا پر کہا کہ وہ عموماً مساجد میں رہتا ہے اور مصروفِ ذکرِ حق دیکھا گیا ہے۔ کبوتر کی آوازِ "ھو" کو صوفیا ذکرِ حق پر محمول کرتے ہیں۔ ۲ گویا "آب" کا حقیقی وجود بھی حرکتِ موج ہی سے ثابت ہے کیونکہ حرکت ہی علامتِ حیات ہے۔ ۳ ناقۂ سیّار: تیز رفتار اونٹنی۔

تو ہی میرا درہم و دینار ہے

تُو ہی میرا اندک و بسیار ہے

تُو ہی میری دولتِ بیدار ہے

رکھ قدم کو تیز تیز، وہ دیکھ منزل ہے قریب!

دشت میں کیا دلکش و زیبا ہے تُو

عاشقوں کو شاہدِ رعنا ہے تُو

حُور کیسی روکشِ[1] حُورا ہے تُو

بہرِ مجنوں غیرتِ لیلا ہے تُو

فخرِ محنت، دخترِ صحرا ہے تُو

رکھ قدم کو تیز تر، وہ دیکھ منزل ہے قریب!

شعلہ زن ہو جب بھی سوزِ آفتاب

دم میں ہو جاتی ہے تُو غرقِ سراب[2]

---

[1] روکشِ حورا: حسن و جمال میں حور سے بھی مقابلہ کرنے والی۔

[2] غرقِ سراب: بظاہر پانی دکھائی دینے والے ریگستان میں گرم سفر ہو جانے والی۔

دشت میں پھیلے جو نورِ ماہتاب
تیز رَو ہوتی ہے تُو مثلِ شہاب[1]
آنکھ تیری ہے سدا محرومِ خواب
رکھ قدم کو تیز تر، وہ دیکھ منزل ہے قریب!

تجھ کو کہئے پارۂ ابرِ رواں
یا ہے تُو اِک کشتیٔ بے بادباں
خضرؑ کی مانند ہے تُو راہ داں[2]
واسطے تیرے سبک ہے ہر گراں
جانِ من! اے لختِ قلبِ ساربان
رکھ قدم کو تیز تر، وہ دیکھ منزل ہے قریب!

تیرے سوزِ دل کی حامل ہے زمام[3]
ساز کا سرمایہ ہے شوقِ خرام

---

[1] شہاب: ٹوٹنے والا تارا جو نہایت تیز رفتار ہوتا ہے؛ [2] راہ داں: راستے کے پیچ و خم سے پوری طرح باخبر؛ [3] زمام: باگ؛

بھوک سے بیتاب ہو یا تشنہ کام
مست ہے لطفِ سفر میں صبح و شام
ہاں تھکاتا ہے تجھے بس اک مقام
رکھ قدم کو تیز تر، وُہ دیکھ منزل ہے قریب!

شام کو تیری جو منزل ہے یمن
صبح کو تیرا پڑاؤ ہے قرن
تیرے قدموں کے لئے ریگِ وطن
بسترِ گُل، یا بساطِ یاسمن[1]!
اے کہ تُو ہے، مثلِ آہوئے ختن[2]
رکھ قدم کو تیز تر، وہ دیکھ منزل ہے قریب!

ماہ بھی اب تھک چکا، بیخود ہُوا
کوہ کے پیچھے وہ جا کر چھپ گیا

---

[1] بساطِ یاسمن: یاسمن کے پھولوں کا بچھونا۔
[2] آہوئے ختن: ختن کا ہرن۔ ختن کے ہرن مشک کی وجہ سے خاص طور پر مشہور ہیں

جلوہ گر ہے صبحِ صادق کی ضیا
جامۂ شب جس نے ٹکڑے کر دیا
دیکھ! رقصاں ہے بیاباں کی ہوا
رکھ قدم کو تیز تر، وہ دیکھ منزل ہے قریب!

میرا نغمہ رنج میں ہے دل کشا
زیر و بم اس کا ہے بے حد جاں فزا
قافلوں کے واسطے ہے یہ درا[1]
فتنہ زا[2] ہے اور کبھی فتنہ رُبا[3]
چل، حرم کی خاک سے ہو چہرہ سا
رکھ قدم کو تیز تر، وہ دیکھ منزل ہے قریب!

٭

---

[1] درا: گھڑیال۔ [2] فتنہ زا: ہنگامہ و انقلاب بپا کرنے والا؛
[3] فتنہ رُبا: فتنہ و فساد کو رفع کرنے والا؛

قطرۂ آب

ہے تعمیرِ ہستی مرا مدعا
کہے کو اگر پھر کہوں، ہے روا

زمیں پر جو بادل سے قطرہ گرا
وہ پہنائے دریا سے نادم ہُوا
کہ ہے پیشِ دریا مری بُود کیا
مَیں ہو جاؤں گا ایک دم میں فنا
معاً آئی دریا سے لیکن صدا
ندامت سے مت چہرہ اپنا چھپا
بہت تُو نے دیکھے ہیں شام و سحر
گلستاں بھی دیکھے ہیں اور دشت و در
کبھی گھاس پر اور کبھی ابر پر
ہُوا عکس سے مہر کے جلوہ گر

کبھی ہمدمِ تشنہ کامانِ راغ[1]
کبھی محرمِ[2] سینہ چاکانِ باغ
کبھی خفتۂ تاک[3] و طاقت گداز
کبھی خفتۂ خاک و بے سوز و ساز
مری موج ہی سے تُو پیدا ہُوا
جُدا ہو گیا، پھر بھی مجھ سے مِلا
تو آسودہ ہو اب مرے سینے میں
تجلّی فشاں ہو اس آئینے میں
گہر ہو جا آغوش میں بحر کے
زیادہ چمک اختر و ماہ سے
نہ لا دل میں لمحے کو خوفِ ممات
ہے ذوقِ خطر سے فروغِ حیات
حوادث سے ہے پختہ تر زندگی
شجاعت سے ہے غیر فانی خودی

۱؎ تشنہ کامانِ راغ: جنگل کے پیاسے درخت اور پودے۔ ۲؎ محرمِ سینہ چاکانِ باغ۔ باغ کے مختلف پھولوں کا رازدار سینہ چاکاں سے مراد ہیں وہ غنچے جو چٹک کر پھول بن رہے ہوں ؛ ۳؎ تاک: انگور کی بیل ہے

گفتگو مابین خدا و انسان

خدا

ہم نے آب و گِل سے بخشے ہیں جہاں کو کیسے رنگ
ہے مگر تیرا تصوّر خالقِ[1] تاتار و زنگ

میری قدرت نے بنایا خاک سے فولاد کو
تیری دانش نے بنائے توپ و شمشیر و خدنگ

تیرے کلہاڑے سے غارت نونہالانِ چمن
تجھ سے نالاں ہیں قفس میں طائرانِ نغمہ زن

انسان

ظلمتِ شب تُو نے پیدا کی مگر میں نے چراغ
خاک سے تیری بنائے میں نے کیا دلکش ایاغ[2]

تیری قدرت سے ہوئے ظاہر اگر کہسار و راغ[3]
میری محنت نے انھیں بخشے ہیں یہ گلزار و باغ

سنگ کو اک دم میں آئینہ بنا سکتا ہوں میں
زہر کو چاہوں تو نوشینہ[4] بنا سکتا ہوں میں

---

[1] یعنی اے انسان! تیرے تصوّر نے تو محض تاتار اور زنگ (حبشہ) جیسے بتانِ وطن بنائے جو نوعِ انسانی میں بنائے نفرت و عداوت ہیں؛ [2] ایاغ: پیالہ [3] راغ: جنگل [4] نوشینہ: شہد

ساقی نامہ

گلشنِ کشمیر کی دیکھو ذرا شانِ بہار
ہیں ستاروں سے مزیّن اس کے گویا مرغزار

طوطیِ[1] و بلبل کے جلوے پیش کرتی ہے زمیں
بارشِ الماس کرتے ہیں یہاں کے آبشار

ہے جمالِ لالہ و گل چشمِ انساں کو کمند
کر رہے ہیں شوخیاں بادِ صبا سے سبزہ زار

دیکھیے غنچے کی آرائش کنارِ آبجو
یہ دلآرا[2] بھی ہے کس انداز سے آئینہ دار

طائرانِ خوش نوا اشجار پر ہیں نغمہ سنج
ساز کا پردہ[3] بنی ہے باغ کی ہر شاخسار

تن میں جاں اور جاں میں سوزِ آرزو بیدار ہے
ہے نفس گویا مسیحا کا یہاں بانگِ ہزار[4]

اونچے اونچے آشیانوں سے نوائے[5] دلگداز
اپنے نغموں میں سمیٹے ہیں صدائے جوئبار

خاک پر اللہ نے گویا عطا کی ہے بہشت
اور کیا اس سے مزیّن یہ کنارِ کوہسار

تاکہ اس کا لطف و رحمت ابنِ آدم کے لئے
ختم کر دے بہرِ جنّت درد و کرب[6] انتظار

اس چمن میں چار چیزوں کی ہے دل کو آرزو
ایک ساغر، اک کتاب اور اک رباب اور اک نگار[7]

---

[1] سبزۂ زمیں کو طوطی سے تشبیہ دی گئی ہے اور پھول کو بلبل سے، بلبل یوں بھی "گندم" کہلاتی ہے ؎

[2] دلآرا: معشوق۔ [3] جس طرح پردہ ساز سے نغموں کا طوفان بپا ہوتا ہے۔ اسی طرح درختوں کی شاخیں بھی نغمہ ہائے طیور سے گونج رہی ہیں۔ [4] بانگِ ہزار: بلبل کی آواز۔ [5] یعنی پرندوں کے دلگداز نغمے آبشاروں کی موسیقی بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہم تک پہنچتے ہیں۔ [6] کرب: درد، دکھ۔ [7] نگار: معشوق ؎

مہ جبیں ساقی! میں تیری دلنوازی پر فدا — کر بزرگوں کی نمایاں مجھ میں کوئی یادگار

وہ مئے پُر جوش میرے جام میں آ کر انڈیل — جس سے سینے میں عیاں ہو اجتماعِ نور و نار

جب پیوں وہ مے، مری مٹی سے لالہ زار اُگیں — باغِ جنت کا امیں بن جائے اک مشتِ غبار

کاشغر سے تابہ کاشاں دیکھ حال اقوام کا — ایک ہی نغمہ سُنائے جا رہا ہے ہر دیار

اُمتوں کی آنکھ سے اب گر چکا وہ اشکِ آب — جس کی نم سے گلستاں پیدا کیا کرتا تھا خار

کاشمیری اس قدر عادی غلامی کا ہُوا — اُس کا ہے مشکل کشا، جس جا بھی ہے کوئی مزار

قلب اُس کا ہو چکا محرومِ جذباتِ بلند — بے خبر ہے وہ خودی سے اور خودی سے شرمسار

سخت کوشی سے ہے اُس کی جسمِ خواجہ[۱] پر حریر — اور ہے قسمت میں اُس کی اک لباسِ تار تار

آنکھ میں مزدور کی ناپید ہے نورِ نگاہ — اور سینے میں ہوا معدوم قلبِ بیقرار

کاشمیری پر چھڑک ساقی! وہ تیز و تند مے
اس کی خاکستر سے جو پیدا کرے برق و شرار

---

۱ خواجہ: سرمایہ دار، حریر: ریشم ۔

شاہین و ماہی

کہا اک بچۂ ماہی نے شاہیں بچے سے اک دن / یہ موجیں جو اچھلتی ہیں حقیقت میں ہے سب دریا
مگرمچھ اس میں بادل سے زیادہ شور افگن ہے / بپا ہے اس میں اک طوفان ان دیکھی بلاؤں کا
سرِ سیلاب پتھر بھی ہیں تودے بھی شجر بھی ہیں / بہت کثرت سے موجوں میں نہاں ہیں لولوئے لالا[۱]
تلاطم ہائے دریا سے گریزاں ہو نہیں سکتے / تہِ پا بھی ہے، سر پر بھی، غرض حاوی ہے وہ ہر جا
رواں بھی ہے، دواں بھی ہے، جواں بھی جاوداں بھی ہے / زمانے کے تغیّر کا نہیں اس کو کوئی کھٹکا
بالآخر بچۂ ماہی کے حرفِ فخر کو سن کر / اُڑا شاہیں بچہ اور ساحلِ دریا کو جب چھوڑا
کہا ہنس کر کہ شاہیں ہوں، زمیں سے کام کیا مجھ کو / مرے بازو کے نیچے ہے، وہ دریا ہو کہ ہو صحرا

فضائے بے کراں میں آ۔ بری ہو قیدِ آبی سے
وہی اس نکتے کو سمجھے، جو رکھے دیدۂ بینا

---

۱ لولوئے لالا : آبدار موتی ہے۔

کرمکِ شب تاب

کرمکِ شب تاب[۱] اک گلشن میں تھا یوں لب کشا
اور کیڑوں کی طرح موذی نہیں ہے میرا نیش[۲]

مَیں جلا سکتا ہوں اپنا آپ بے احسانِ غیر
محرمِ باطن تو ہوں، لیکن نہیں پروانہ کیش[۳]

شب ہرن کی آنکھ سے بھی ہو اگر تاریک تر
آپ روشن ہو کے بنتا ہوں چراغِ راہبر!

تنہائی

مَیں نے دریا پہ کہا اک موجۂ بے تاب سے
تُو ہے گرمِ جستجو، ہے پیش کیا مشکل تجھے

لولوئے لالا[۱] تو لاکھوں ہوں گے تیری جیب میں
ہے جواہر میں میسر مجھ سا کوئی دل تجھے

اُس نے اک غوطہ لگایا، اور تڑپ کر مجھ سے کہا

---

۱ کرمکِ شب تاب: رات کو روشن کرنے والا کیڑا، مراد جگنو۔ ۲ نیش: ڈنک۔ ۳ پروانہ کیش: پروانہ کا آئین و مسلک رکھنے والا، جو شعلے پر جا گرتا ہے اور "گدائے تجلیٔ غیر" ہے ۱ لولوئے لالا: آبدار موتی

پھر گیا مَیں کوہ کی جانب کہا اے سرد مہر
کان تک تیرے کبھی پہنچی مری آہ و فغاں؟

قطرۂ خوں سے جو تیرے سنگ میں ہے کوئی لعل
مجھ سے گرمِ گفتگو ہو، بن تُو میرا راز داں!

کوہ نے سینہ دکھایا اور نہ کچھ مجھ سے کہا

پھر سفر کر کے مَیں پہنچا ماہ تک اُس سے کہا
اے مسافر! تیری قسمت میں کوئی منزل بھی ہے؟

تیرے پرتو سے جہاں ہے سر بسر فرشِ سمن[1]
داغ کافی ہیں ترے سینے میں لیکن دل بھی ہے؟

سُن کے یہ وہ تلملایا، اور نہ کچھ مجھ سے کہا

پھر حضورِ حق گیا مَیں، ماورائے مہر و ماہ
اور کہا میرا نہیں دنیا میں کوئی آشنا

دل سے خالی ہے زمانہ اور مَیں یکسر ہوں دل
تیرے گلشن سے بہت ممتاز ہے نغمہ مرا

اس پہ یزداں مُسکرایا، اور نہ کچھ مجھ سے کہا

---

[1] فرشِ سمن: سمن ایک سفید رنگ پھول ہے۔ لہٰذا چاندنی کو فرشِ سمن سے تشبیہ دی ؛

قطرۂ شبنم

یہ حکم ہُوا چھوڑ دے اوجِ مہ و پرویز

کر بحرِ پُر آشوب میں پھر شوق سے آمیز

کر موج پہ مہمیز[۱]!

نقشِ دِگر انگیز[۲]!

تابندہ گہر خیز!

مَیں نے نہ لیا لطفِ ہم آغوشیٔ دریا

جو بادہ کرے مست، نہ اُس کو کبھی چکھا

مَیں خود سے نہ بھاگا

آفاق کو چھوڑا

بس لالے پہ ٹپکا

[۱] مہمیز گھوڑے کو ایڑ لگانا، یہاں بمعنی حملہ۔ [۲] یعنی ایک تازہ بتازہ نقش پیدا کر۔

گُل بولا کہ ہنگامۂ مُرغانِ سحر کیا؟
یہ انجمن آراستہ بالائے شجر کیا؟

یہ زیر[1] و زبر کیا؟
پایانِ[2] نظر کیا؟
خنارِ گلِ تر کیا؟

تُو کون ہے مَیں کون ہوں، یہ جذبِ وفا کیا؟
شاخوں پہ مری طائرکِ نغمہ سرا کیا؟

مقصودِ نوا کیا؟
مطلوبِ صبا کیا؟
یہ کہنہ سرا[3] کیا؟

میں[4] بولا چمن رزمِ حیاتِ ہمہ جائی!
اِس بزم کا شیرازہ ہے احساسِ[5] جُدائی!

---

[1] زیر وزبر: پابندیٔ جہات - [2] پایانِ نظر: حدِ نظر - [3] کہنہ سرا: پُرانی سرائے ، مراد دُنیا۔
[4] یعنی قطرۂ شبنم نے جواباً کہا - [5] احساسِ جُدائی: اقبال کے نزدیک ہر شے کی حرکتِ عمل احساسِ جُدائی سے ہے۔ اسی بنا پر فرمایا ہے

گرمیِ آرزو فراق! شورشِ ہائے وہو فراق!
موج کی جستجو فراق! قطرے کی آبرو فراق!

دم ؟ گرمِ نوائی !

جاں ؟ چہرہ کشائی !

یہ رازِ خدائی !

مَیں چرخ سے ٹپکا، تو ہُوا خاک سے برپا

بس ذوقِ نمو ہی تجھے اس دہر میں لایا

جب شاخ سے نکلا

سو پردوں کو پھاڑا

اور خود کو تُو پہنچا !

پھُولوں میں طراوت ہے مرے اشکِ سحر سے

دُنیا بھی ہے آباد مرے حُسنِ نظر سے

تسخیرِ جگر سے !

انوارِ بصر سے !

۱ے ذوقِ نمو : نمودار ہونے کی خواہش۔ شوقِ ہستی ؛

اشکوں کے گہر سے!

ہر پھول کے جامے میں لگا ہے کوئی کانٹا
کانٹا ہے، مگر اُس کا ہے محبوب سے رشتا

ہے عشق سے ڈبلا
محبوب کو پایا
گلشن کا ہے تحفا

اُٹھ صحبتِ دیرینہ سے دِل اپنا اُٹھا لے
اور رنگِ شفق سے تُو نگاہوں کو لڑا لے

مِل اہلِ نظر سے
لے چرخ کے تارے
اُڑنا ہو تو اُڑ لے

عشق

فکر نے جب جستجو میں رکھ دیا اُٹھ کر قدم
خوب دیکھا میں نے خلوت[1] خانۂ دیر و حرم

ہو گیا دشتِ طلب میں مثلِ مجنوں میں رواں
کاروانِ حُسن کے پیچھے رہا پیہم دواں[2]

بے خضر ہی گامزن میں سوئے منزل ہو گیا
یوں تصوّر بھی مرا لیلائے محمل ہو گیا

گو تلاشِ مے تھی لیکن تھا شکستہ میرا جام
صبح کی مانند پھیلایا ہوا پر اپنا دام

دِل مرا بے کل برنگِ موجِ دریا ہی رہا
میں پریشاں حال مثلِ بادِ صحرا ہی رہا

عشق نے آخر مرے دِل کو اُڑایا ناگہاں
دردِ باطن کو مرے اُس نے مٹایا ناگہاں

عشق نے ظاہر کئے آنکھوں پہ ہستی اور عدم
عقل کے بُت خانے کو اُس نے کیا آکر حرم[3]

میرے خرمن میں گرائے اُس نے بجلی کے شرر
اُس نے مجھ کو لذتِ سوز و تپش کی دی خبر

عشق کے جلوے سے میں بیہوش ہو کر گر پڑا
عکس کی صورت میں خود سے ہو گیا آخر جُدا

جانِ جاں! دل میں جو پنہاں تھا تری اُلفت کا راز
اُس سے تُو نے خاک کو بھی عرش کا بخشا فراز[4]

[1] خلوت خانۂ دیر و حرم: کعبہ اور بُت خانہ کے اندرونی راز۔ [2] دواں: دوڑتا رہا - تعاقب میں رہا۔
[3] حرم: کعبہ، یعنی عشق ہی نے مجھے ایمانِ کامل بخشا۔ [4] فراز: بلندی۔

میری کشتی پا چلی ہے اب تو ساحل کا وصال
میری ہر زشتی[1] سے اُبلا ایک طوفانِ جمال

جُز محبت یاد مجھ کو کوئی افسانہ نہیں
اپنا دیوانہ تو ہوں، غیروں کا دیوانہ نہیں

عشق کی شورش نے قطرے سے کیا دریا مجھے
طعنہ و تشنیع کی ہرگز نہیں پروا مجھے

عشق نے فطرت میں پیدا کر دیا سوز و گداز
ہو چکا ہوں عِلم کے جلووں سے یکسر بے نیاز

ذوقِ خطر

اک ہرن سے دُوسرا کہنے لگا با رنج و غم
مَیں تو آئندہ حرم ہی میں بناؤں گا کُنام[2]

دشت میں اکثر شکاری ہیں ہماری گھات میں
موت کا خدشہ لگا رہتا ہے اس جا صبح و شام

فتنۂ صیّاد سے مطلوب ہے مجھ کو اماں
دِل کو اپنے چاہتا ہوں بے ہراس و شادماں

سُن کے یہ کہنے لگا وہ اے رفیقِ باشعور
زندگی کو اپنی خطروں ہی میں کر ہر دم بسر

[1] زشتی: بدصورتی۔
[2] کُنام: جائے قیام، مسکن۔

حادثوں کے سنگ پر تو پھینک خود کو ہر گھڑی
اِس عمل سے زندگی کی تیغ ہوگی تیز تر!

ہے "خطر" ہر چیز کی تاب و تواں کا امتحاں
زندہ و بیدار اِس سے ممکناتِ جسم و جاں!

جہانِ عمل

یہ مے کدہ ہے، اس جگہ دعوت بھی عام ہے
اُتنی ہی مے بھی دیتے ہیں جتنا کہ جام ہے
وہ لفظ جو ہنوز ہے بیگانۂ[1] نوا
ٹپکا ہے لب سے جام کے نقشِ کلام ہے
ہم ہیں نفور "قال[2]" سے، نشّہ ہے "حال" کا
جو فلسفے کا نکتہ ہے، وہ دُردِ جام ہے

[1] بیگانۂ نوا! جو ابھی بولنے میں نہیں آیا ؛ [2] "قال" محض نظریہ ، "حال" عمل

ہم نے عمل کی راہ میں بدلا نظامِ دہر
اُس کی سحر کا مہر یہاں زیبِ بام[1] ہے
اے وہ جو رازہائے خودی کو نہ پا سکا
تیرا جو ہے "سکون" یہاں وہ "خرام" ہے
ہم نے طلب کی راہ میں جنگ و جدل کیا
پھُونکی جو رُوح علم میں، اُس کو "عمل" کیا!

زندگی

جو پُوچھے مَیں نے معنیٔ زندگی کے ایک دانا سے
وہ بولا "مے، کہ جتنی تلخ ہو اتنی نکوتر ہے!"
مَیں بولا "زندگی کیڑا ہے جو پیدا ہے مٹی سے"
وہ بولا "اصل اس کی آتشیں مثلِ سمندر[2] ہے!"
مَیں بولا "شر ہی شر ہے زندگی کی فطرتِ بد میں"
وہ بولا "خیر کو سمجھا نہیں تُو، بس یہی شر ہے!"

---

[1] یعنی ہم نے قوتِ عمل سے جب نظامِ دہر بھی بدل ڈالا تو دیکھا کہ جس وقت دُنیا کا سورج طلوع ہُوا، اُس وقت ہمارا سورج نصف النہار پر تھا؛

[2] سمندر: ایک جانور جو آگ میں سے پیدا ہوتا ہے؛

مَیں بولا "ہے وہ غرقِ سیر اور پائی نہیں منزل"
وہ بولا "منزلِ ہستی سفر ہی میں تو مضمر ہے!"

مَیں بولا "خاک سے پیدا ہوئی، لَوٹی بھی وہ اُس میں"
وہ بولا "دانہ جب مٹی کو چیرے، وہ گُلِ تر ہے!"

حکمتِ فرنگ

مُلکِ ایراں میں سُنا ہے ایک تھا مردِ گزیں[1]
موت و ہستی کے مسائل میں نہایت نکتہ بیں

جاں کنی کی سختیاں وہ جھیل کر جب مر گیا
موت کی تکلیف کے شکوے سے دل معمور تھا

رو پڑا پیشِ خدا وہ بادلِ اندوہناک
اور کہا سینہ اجل کے ظلم سے ہے چاک چاک

موت کو آتا نہیں فنِ جدیدِ جاں کنی
خام ہے وہ اپنے فن میں باوجودِ یک فنی[2]

جان تو لیتی ہے، لیکن ہے وہ محرومِ کمال
ہے نئی دُنیا میں بھی اُس کی پُرانی چال ڈھال

اہلِ مغرب جانتے ہیں علم کے تازہ طریق
ایک قطرے سے بنا دیتے ہیں وہ بحرِ عمیق

---

[1] مردِ گزیں : ایک ممتاز انسان، صاحبِ فہم و ذکا ہستی ؛
[2] یک فنی : ایک ہی فن میں ماہر ہونا ؛

موت سے محصور رہتا ہے سدا اُن کا خیال
روز و شب بیٹھے بناتے ہیں قوانینِ وبال

آبدوزیں ہیں سمندر میں وہاں مثلِ نہنگ[1]
اور فضا بھی اُس کے طیاروں سے ہے میدانِ جنگ

اِس زمیں سے بھی ذرا دیکھو تو چشمِ ماہ و ہور[2]
توپ و بم کے دود سے دن کو نظر آتی ہے کور[3]

مارنے میں اسلحہ افرنگ کے ہیں ایسے تیز
جن کی ہیبت سے ہے عزرائیل بھی کرتا گریز

بھیج دیوِ موت کو تو اے خدا سوئے فرنگ
تاکہ یہ ناپختہ سیکھے فنِ مرگِ بے درنگ[4]!

تا یہ دُنیا جاں کنی کے درد سے پائے نجات
اور جہاں کی لوح سے مِٹ جائیں آثارِ حیات!

حُور و شاعر

حور

بادہ خواری کیا تو مجھ کو دیکھتا تک بھی نہیں
رسم و راہِ عشق سے تُو ہے ابھی نا آشنا

---

[1] نہنگ : مگرمچھ ۔ [2] ماہ و ہور : چاند اور سورج ۔ [3] کور : اندھی ، بے نور
[4] مرگِ بے درنگ : فوری اور ناگہانی موت ۔

آرزو و جستجو کا تجھ میں پیدا سوز و ساز
حُسن کے دِل کو ہے پارہ کر رہا نغمہ ترا
شعر سے تُو نے بنایا وہ جہانِ دل نشیں
سامنے جس کے ہے جنّت بھی طلسمِ سیمیا[1]

شاعر

قلبِ رہرو کے لئے گفتار تیری ہے کمند
تُو تو گُل ہے، پر مجھے مطلوب ہے اک نوکِ خار
میری فطرت کو قیام و صبر سے نفرت رہی
ہے صبا کی مثل میرا قلب ہر دم بے قرار
جب نظر کو گھیر لے کوئی نگارِ خوبرو[2]
چاہتا ہے دِل مرا اُس سے بھی عمدہ تر نگار

[1] سیمیا: ایک موہوم چیز؛ [2] نگارِ خوبرو: حسین معشوق؛

گہ شرر، گہ نجم، گہ مہتاب اور گہ آفتاب
مَیں ہوں منزل کا مخالف، موت ہے مجھ کو قرار

جب مَیں پی لوں ساغرِ بادِ بہاری سے شراب
نغمۂ نو سے مرے گونجے ہوائے نو بہار

اِک جہانِ بے نہایت کو مَیں کرتا ہوں تلاش
ہَیں نگاہیں صبر سے بیزار، دِل امّیدوار!

ہے دِلِ عاشق کی بربادی بہشتِ جاوداں
درد سے لبریز شیون ہے نہ غم ہے غمگسار!

زندگی و عمل

ساحلِ افتادہ بولا گو میں عرصے تک جیا
یہ نہ لیکن کھل سکا، میں کس لئے ہوں اور ہوں کیا
تیز رفتاری سے بھاگی اور بولی ایک موج
زندہ ہوں جب تک رواں ہوں، اور جو رک جاؤں، فنا!

المُلکُ لِلّٰہ

طارق نے اندلس میں جو بیڑا جلا دیا
بولی سپاہ "عقل کی رُو سے یہ ہے خطا

ہم ہیں وطن سے دُور جو لوٹیں تو کس طرح
ترکِ سبب کہاں ہے شریعت میں بھی روا؟"

طارق نے ہنس کے تیغ کو تھاما تو یہ کہا
"ہم کو کوئی بھی کر نہیں سکتا کبھی فنا!

تبلیغِ حق کے واسطے آئے ہیں ہم یہاں
اللہ جس کے ساتھ ہو اُس کو ہے خوف کیا

ورثہ ازل سے مومنِ مخلص کا ہے زمیں[1]
ہم کو خدا نے ملک کا اپنے کیا امیں!"

---

[1] تلمیح بآیۂ شریفہ: وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُونَ
یعنی "ہم نے نصیحت کے بعد 'زبور' میں بھی لکھ دیا تھا کہ ہم اپنی زمین کا وارث اپنے نیک بندوں کو کریں گے"۔

جوئے آب[1]

دیکھ کس مستی سے چلتی جا رہی ہے جوئے آب
کہکشاں کی طرح روشن کر دیے ہیں مرغزار

ابر کے جھولے میں وہ سوئی ہوئی تھی ناز سے
کوہ کے دامن میں اترا اُس کی آنکھوں کا خمار

سنگ ریزوں سے بھی نغمے اس نے پیدا کر دیے
مثلِ آئینہ ہے ماتھا اُس کا یکسر بے غبار

بحرِ بے پایاں کی خاطر ہے وہ دوڑی جا رہی
رقص کرتی، ناز کرتی، گنگناتی، گا رہی!

اس کے رستے میں بہاروں کے پری خانے عیاں
لالہ و نرگس کے لہرائے چمن میں بادباں

جھوم کر پھولوں نے اُس کو لے لیا آغوش میں
اور غنچے کھلکھلا کر ہو گئے دامن کشاں

نونہالانِ چمن کے جلوے سے ہے بے نیاز
سینۂ ہر کوہ و صحرا چیر کر ہے وہ رواں

---

[1] "جوئے آب"، گوئٹے کی مشہور نظم موسوم بہ "نغمۂ محمدؐ" کا ایک نہایت آزاد ترجمہ ہے۔ اِس نظم میں جو "دیوان مغربی" سے بہت پہلے لکھی گئی تھی، المانی شاعر نے زندگی کے اسلامی تخیل (یعنی سخت کوشی اور جدّ و جہد) کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اصل میں یہ ایک مجوزہ اسلامی ڈرامے کا جزو تھی جس کی تکمیل اُس سے نہ ہو سکی۔ اس ترجمے سے صرف گوئٹے کا نقطۂ نگاہ دکھانا مقصود ہے۔!

بحرِ بے پایاں کی خاطر ہے وہ دوڑی جا رہی
رقص کرتی، ناز کرتی، گنگناتی، گا رہی!

سیل[1] کی تسخیر سے مرعوب ہیں سب باغ و راغ[2]
بولے وہ ہوں وسعتیں دھرتی کی تجھ کو سازگار

ہم تو اب تک تنگ ظرفی سے ہیں محرومِ سفر
دیکھ! ہم پر مت گریں ریگِ بیاباں کے شرار

مشرق و مغرب کے طوفاں کے مقابل سینہ زور
ہے بغل میں اس کی، طاقتور ہو یا زار و نزار

بحرِ بے پایاں کی خاطر ہے وہ دوڑی جا رہی
رقص کرتی، ناز کرتی، گنگناتی، گا رہی!

بن گئی ندی ہی دریا، توڑ کر بند و شکن
روند ڈالے پاؤں میں سب وادی و کوہ و دمن

اس کی موجوں میں بہے جاتے ہیں سب پست و بلند
ہیں مساوی اس کو قصرِ شاہ اور کشت و چمن

عزم و استقلال سے ہے پُر جلال و بیقرار
نقشِ تازہ ہے بناتی توڑ کر نقشِ کہن

بحرِ بے پایاں کی خاطر ہے وہ دوڑی جا رہی
رقص کرتی، ناز کرتی، گنگناتی، گا رہی!

[1] سیل: موج   [2] راغ: جنگل

نامۂ عالمگیرؒ

(ایک فرزند کے نام جو مرگِ پدر کی دُعا کیا کرتا تھا)

کیا نہیں معلوم تجھ کو اے مرے ناداں پسر
مضطرب اللہ کو کرتی نہیں آہِ بشر

خاکِ آدم پر حوادث کی ہے پیہم ترکتاز
درد سے مخلوق کے لیکن خُدا ہے بے نیاز

آئنہ اُس پر بنی آدم کا ہے حالِ تباہ
اور سُنتا ہے دِلوں کی ہر گھڑی غمناک آہ

بے کسی میں چل دیے دُنیائے فانی سے حسینؓ
حشر برپا کر گیا ہنگامۂ بدر و حنین

پیرِ کنعاں روتے روتے آخر اندھا ہو گیا
اور بدن ایّوب کا کیڑوں سے بھرتا ہو گیا

پھر بھی پیدا ہو سکا دل میں نہ اُس کے اضطراب
کچھ نہ کی آہ و فغاں، ہر گز نہ کھایا پیچ و تاب

عالمِ ہر خیر و شر، جو خود بھی ہے نخچیر گر[۱]
وہ ترے دامِ دُعا میں ہو نہیں سکتا اسیر

اے کہ میری موت کی کرتا ہے تُو ہر دم دُعا
کیا تری قسمت میں لکھی ہے ہمیشہ کی بقا؟

۱؎ نخچیر گیر: شکاری: یعنی خدا بذاتِ خود ایک پُرانا شکاری ہے۔ وہ تیری بددعا کے دام میں کیونکر گرفتار ہو سکتا ہے؟

بہشت

حوادث سے ہے دُنیا میں کوئی خنداں کوئی گریاں
کہاں پیدا ہے جنّت میں ہمارا گنبدِ گرداں

وہاں یوسفؑ نے دیکھا ہی نہیں کوئی درِ زنداں
زلیخا کو محبت میں نہیں حاصل دلِ نالاں

حریفِ آتش کا ابراہیمؑ کوئی کب ہے جنّت میں
نہ صوتِ لن ترانی ہے نہ موسیٰؑ ہے شررِ درجاں[1]

خزاں کے تُند جھونکوں کا اثر کب ہے بہاروں پر
وہاں کشتی پہ حملہ ہی نہیں کرتا کوئی طوفاں

یقیں آزاد ہے یکسر شک و وہم و تذبذب سے
نہیں فرقت کے اندیشے سے وصلِ دلربا نالاں

ملے گی کس طرح عقلِ غلط اندیش کو لذّت
اگر رکھتی نہ ہو منزل ہماری اک رہِ پیچاں؟

نہ جی تو ایک لمحے کو بھی اُس بد ذوق دُنیا میں
جہاں یزداں ہی یزداں ہے مگر نابود ہے شیطاں

---

[1] شررِ درجاں: مضطرب، دیدارِ تجلّی کے لئے بے چین۔

کشمیر

خطۂ کاشمر میں جا، کوہ و تل[1] و دمن کو دیکھ
سبزے کی وادیوں کو دیکھ، لالے کے بھی چمن کو دیکھ

بادِ بہار موج موج، مرغِ بہار فوج فوج
صلصل[2] و سار زوج زوج زینتِ نارون کو دیکھ

تاکہ نہ حُسنِ باغ کو چرخ کی بھی نظر لگے
چہرۂ خاکِ باغ پر برقعِ نسترن کو دیکھ

لالے میں خُوں ہوا رواں، موج ہے نہر میں تپاں[3]
خاک شرر شرر ہوئی، آبِ شکن شکن کو دیکھ

چھیڑ دے تارِ ساز کو، ڈال شراب جام میں
قافلۂ بہار کی رونقِ انجمن کو دیکھ

---

[1] تل و دمن: تل: ٹیلہ - دمن: کوڑے کرکٹ کا ڈھیر۔ [2] صلصل: فاختہ - سار: نام ایک پرندۂ بارنگ خوش آواز کا - نارون: نام ایک درخت کا جو نہایت خوش اندام، سایہ دار اور راست ہوتا ہے شعرا معشوق کے قد کو عموماً اس سے تشبیہ دیتے ہیں۔ [3] تپاں: بے چین، متحرک۔

دخترِ برہمن ہے کیا لالہ رُخ و سمن بدن
حُسن پہ اُس کے کر نظر، بعد میں اپنے من کو دیکھ!

عشق

اِس عقلِ جہاں بیں کا اک جذبۂ بے باکی
لیتا ہے محبت سے آئینِ جہاں تابی
ہے عشق ہی سے دِل میں ہر جذبہ و کیفیت
تاب و تبِ رُومی سے تا حیرتِ فارابی
پڑھتا ہوں جو یہ مصرع ہو جاتا ہوں میں رقصاں
ہے عشق ہی سے تسکیں اور عشق سے بے تابی!
ہر مطلبِ پیچیدہ لفظوں میں نہیں آتا
ڈوبے گا اگر دل میں[1] پالے گا تو شادابی!

---

[1] اقبال کے نزدیک اسرارِ ہستی کا حقیقی ترجمان دل ہے نہ کہ عقل۔ دِل چونکہ نُورِ عشق سے فروغ پاتا ہے، لہٰذا فرمایا: ؎
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بُنیاد رکھ

بندگی

میکدے میں مجھ سے یوں کہنے لگا اک مغبچہ
میں بتاتا ہوں تجھے اک جملۂ حکمت فزا

حسن و قیمت میں فزوں تر ہے یہ کوہِ نور سے
صورتِ آویزہ اس کو کان میں اپنے سجا

مے گسارانِ کہن[1] کا ہے یہ اک فرمانِ خاص
عینِ مستی میں بھی مت کھو نظم اپنے ہوش کا

میں نہیں کہتا لگا ہونٹوں پہ مُہرِ خامشی
با ادب رہ اور رمے اندازِ رہی سے پی پلا

جسمِ آدم کے لئے رُوحِ رواں ہے جستجو[2]
بندگی کھو کے نہ کر جبرِ خدا کی آرزو!

غلامی

آدمی برداشت کرتا ہے غلامی کا ستم
اس کی ہیں تقدیر کے مالک فقط دارا و جم[3]

بندگی کی خُو سے یہ کُتّوں سے بھی ہے خوار تر
سگ بھی پیشِ سگ نہیں کرتا کبھی سر اپنا خم

---

[1] مے گسارانِ کہن: پُرانے رند۔ [2] جستجو: اقبال "آرزو" کے ساتھ ہی ساتھ "جستجو" کو بھی فروغِ حیات کے لئے نہایت ضروری سمجھتا ہے، اور اُس کے نزدیک جذبۂ جستجو کے بغیر زندگی موت سے بدتر ہے؛
[3] جم: جمشید۔ "دارا و جم" سے مراد ہیں مطلق العنان اور مستبد سلاطین؛

چیستانِ شمشیر

کیا ہے وہ سخت کوش کہ پتھر سے پائے آب
محتاجِ خضر مثلِ سکندر[1] نہیں ہے وہ

مثلِ نگاہِ دیدۂ پُرنم ہے پاک رُو
ہے غرق جوئے آب مگر تر نہیں ہے وہ

مضمون اُس کا ایک ہی مصرع میں ہے تمام
منت پذیرِ مصرعِ دیگر نہیں ہے وہ

جمہوریت

جو دونِ فطرت ہیں اُن سے خیر کا ہرگز نہ ہو طالب
نہیں چیونٹی سے ممکن شوخیٔ طبعِ سلیمانی

غلامِ پختہ کاراں ہو مٹا دے سحرِ جمہوری
گدھوں کے سر میں کیونکر آئے نورِ فکرِ انسانی!

[1] سکندر خضر کا محتاج اس بنا پر تھا کہ وہ اس سے چشمۂ آبِ حیات کا طالب تھا!

بہ مبلغِ اسلام در فرنگستان

جلائی کفر نے پھر اُٹھ کے آتشِ نمرود
فروغ گیر ہوا جوہرِ مسلمانی

خدا کے واسطے داغِ جگر سے پردہ اُٹھا
فیوضِ مہر کا باعث ہے اس کی عریانی

تری نگاہ کا مرکز ہیں دلیرانِ فرنگ
بُتوں کو تُو نے کُھلایا بہ علمِ برہانی[1]!

دکھا دے جلوہ سلیمیٰ[2] کا پھر حجازی کو
یقیں سے کر دے ضیا گیر قلبِ تورانی

سُنا عراق و خراساں کو نغمہ ہائے ازل
عجم کی بزم میں پھر تازہ کر غزل خوانی

عجب نہیں کہ جگا دے اُنھیں تری مضراب
کہ کھو چکا ہے بہت نغمے سازِ افغانی

حدیثِ عشق سُنا مت ہوس کے بندوں کو
دکھا نہ چیونٹی کو تُو سرمۂ سلیمانی

---

[1] علمِ برہانی: وہ علم جو محض منطقی دلائل اور عقلی نظریات پر مبنی ہو۔
[2] سلیمیٰ: ادبیاتِ عرب میں معشوقہ کا فرضی نام۔

غنی کشمیری

تھا غنی کشمیر کا اک شاعرِ بلبل صفیر
شعر گوئی کے جہاں میں بے عدیل و بے نظیر

گھر میں جب ہوتا تو وہ زنجیر لیتا تھا لگا
اور جب جاتا وہ باہر، چھوڑتا در کو کھلا

ایک نے اُس سے کہا اے شاعرِ رنگیں نوا
فعل پر تیرے ہے ہر اک محوِ حیرت ہو رہا

سُن کے یہ کیا خوب فرمانے لگا مردِ فقیر
جو فقیری میں بھی تھا اقلیمِ معنی کا امیر

"دوست سمجھیں غور سے حکمت جو میرے فعل کی
میرے گھر میں جز مرے ہے اور دولت کونسی؟

اپنے کاشانے کے اندر ہے غنی جب تک نہاں
اُس کے گھر میں بالیقیں موجود ہے لعلِ گراں

جانِ محفل ہے وہ۔ خالی اُس سے جب کاشانہ ہے
پھر اُسے کاشانہ کیا کہیے۔ وہ اک ویرانہ ہے"

خطاب بہ مُصطفیٰ کمال پاشا

ایک اُمیؐ کی ضیا باریٔ حکمت سے سبھی
واقفِ سِرِّ نہاں خانۂ تقدیر ہوئے

اصل، ہم سب کی فقط ایک شرر تھا بے رنگ
اک نظر اُس نے جو کی، مہرِ جہانگیر ہوئے!

کیا مُریدوں سے کہوں، پیر ہے محرومِ یقیں
ہم یہاں خوار باندازۂ تقصیر ہوئے

بادِ صحرا[1] سے شگفتہ تھے ہمارے سب پھول
جب صبا[2] آئی تو ہم غنچۂ دلگیر ہوئے

آہ، وہ غلغلہ جو چرخ سے جاتا تھا پرے
بن گیا نالہ، جو ہم محوِ بم[3] و زیر ہوئے

کتنے ہی صید کیے بے دام ہی پکڑے ہم نے
اب ہیں گو تیر و کماں، کشتۂ نخچیر[4] ہوئے

"اسپِ ہمت" کو جہاں تک بھی ہو کر دے مہمیز
بارہا دہر میں ہم کشتۂ تدبیر[5] ہوئے

۱۔ بادِ صحرا: مراد عرب کی خالص اسلامی تہذیب جسے رسول کریمؐ نے پیش کیا۔ ۲۔ صبا: مراد مغرب کی اجنبی تہذیب جس نے تمدّنِ اسلامی کو مسخ کر دیا۔ ۳۔ بم و زیر: نغمے کے اونچے اور نیچے سُر۔ ۴۔ کشتۂ نخچیر: خود شکار کا شکار ہو جانا یعنی اب سامانِ شکار ہونے کے باوجود ہم اپنے شکار سے مرعوب ہیں۔ حاصل یہ کہ ایک زمانہ میں سامانِ جنگ مفقود ہوتے ہوئے بھی ہم کفار پر غالب تھے۔ آج سامانِ جنگ ہوتے ہوئے بھی ہم بوجہ ضعفِ ایمان کفار سے مرعوب و مغلوب ہیں۔ ۵۔ یعنی محض تدبیر بلا عمل و تسخیر ہمیں اکثر دھوکا دیتی رہی ہے۔

طیّارہ

پرندہ گلستاں میں اک شاخ پر / یہ کہتا تھا با طائرانِ دگر
"نہیں بال و پر آدمی زادے کے / زمیں پر رہے خیمے اس سادے کے"
میں بولا کہ "اے طائرِ خوش ادا / اگر حق کہوں، مان نامت بُرا
فلک پر ہے انساں کی رہگزر / بنائے ہیں طیّارے سے بال و پر
وہ طیّارہ ہے مُرغِ گردوں سپر / ملک سے بھی پر اُس کے ہیں تیز تر
وُہ اُڑتا ہے یوں جیسے شہباز ہے / سبک سیر ہے، برق پرواز ہے
بدن میں جو ہے اُس کے زورِ عقاب / نظر پر عیاں ہند "تا فاریاب!
فلک پر خروشندہ و تند جوش / نشیمن میں ہے مثلِ ماہی خموش
ذرا دیکھ عزمِ بشر کی دلیل / ہُوا آب و گِل سے عیاں جبرئیل
زمیں سے فلک تک ہے وہ رہنما / یہ ہے عقلِ انساں کا اک معجزا"

سُنا مُرغ نے جب یہ میرا کلام
مجھے دیکھ کر صورتِ آشنا
نہیں عقل پر تیری حیرت مجھے
"خلافت" سے بیشک تو ہے ارجمند

مَیں سمجھا وہ سمجھا البشر کا مقام
پروں کو وُہ کھُجلا کے کہنے لگا
مَیں منکر نہیں تیری تسخیر سے
ترے عزم کو ایک پست و بلند

زمیں پر جو تھا کام۔ وہ کر لیا؟
کہ اب آسماں پر بھی اُڑنے لگا؟

عشق

وہ حرفِ دلفروز جسے عشق کہتے ہیں
حل کر رہا ہوں عشق کے دونوں ہی یہ سوال

اُس کے نہفتہ[1] راز کو کرتا ہوں مَیں عیاں
کس نے سُنا یہ راز، کیا کس سے پھر بیاں؟

شبنم نے پہلے راز یہ گُل کو سُنا دیا
بُلبل سے گُل نے کہہ دیا، پھر لے اُڑی صبا

[1] نہفتہ: پوشیدہ

تہذیب

چہرے کو دے کے غازۂ[۱] تہذیب سے جِلا

انساں چمک چمک اُٹھا آئینے سے سوا

ہاتھوں میں بھی پہن لئے دستانۂ حریر[۲]

کھولی کمر سے تیغ، قلم پر فدا ہُوا

پھر "صلحِ کُل" کا ایک بنا کر صنم کدہ[۳]

وہ اُس کے گرد ساز سے رقصاں بھی ہو گیا

فطرت کو اس کی جنگ نے آخر کیا جو فاش

جُز "یَسْفِكُ الدِّمَا"[۴] و "خَصِیْمٌ مُّبِیْں"[۵] نہ تھا

---

۱ غازہ: پاؤڈر۔ ۲ حریر: ریشم۔ ۳ صنم کدہ: بُت خانہ۔ "بُت کدۂ صلحِ کل" سے مراد ہے، جمعیت الاقوام جس کا مقصدِ وحید دنیا میں امن تھا۔ ۴ تلمیح بہ آیہ شریفہ: اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ۔ ترجمہ (روزِ ازل فرشتوں نے کہا) کیا تُو زمین میں ایک ایسے شخص کو (اپنا نائب بنا کر) بھیج رہا ہے جو اس میں فتنہ و فساد اور خونریزی کا بازار گرم کر دے گا؟"

۵ یہ سورۂ یٰسٓ کی ایک آیۂ شریفہ کا جزو ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان سیدھی سادی اور بیّن چیزوں میں بھی جنگ و جدال اور بحث و تمحیص کو دخل دیتا ہے۔

مئے باقی

(غزلیات)

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ساقی

بہار نے جو سجائی چمن میں بزمِ سرود
نوائے بلبلِ شوریدہ چشمِ غنچہ کشود
گماں نہ کر کہ ازل میں تھی گِلِ[1] مری گُل ریز
کہ مجھ سے اب بھی ضیا گیر ہے ضمیرِ وجود
غرورِ علم نہ کر، مے میں ہے اثر کچھ اور
فقیہِ شہر بھی اس سے ہے آستیں آلود

[1] گِل: مٹی۔ یعنی صرف ازل ہی میرے وجود سے روشن نہ تھی۔ بلکہ آج بھی بزمِ وجود میری ذات سے بارونق ہے۔

بہار نے تو فقط برگ کر دیے یک جا
مری نظر[۱] سے گُل و لالہ ہیں ہے رنگ نمود

خودی میں ڈوبنے والوں کی یہ نشانی ہے
کریں گے وہ نہ کبھی بحثِ غائب و موجود[۲]

شراب خانے میں اک پیرِ زندہ دل نے کہا
ہَیں ہر زماں میں براہیمؑ و آتشِ نمرود![۳]

بنائے مَیں نے بہت نقش قصرِ ہستی میں
کیا قضا نے بالآخر سبھی کو محو و نبود

تُو اہلِ دیر سے ہو نرم گو کہ عشقِ غیور
صنم کدے سے بدل دیتا ہے دلِ محمود

ہے خاکِ ہند میں بے سود میرا سوزِ نوا
نہ رُوح پھُونکے گا مُردے میں نغمۂ داوٗدؑ

۱؎ یعنی گُل و لالہ بھی اگر حسین و جمیل دکھائی دیتے ہیں تو فقط میرے حُسنِ نظر سے۔ ۲؎ بحثِ غائب و موجود اس لئے نہ کریں گے کہ موجودِ حقیقی تو صرف خودی (انا) ہے۔ ۳؎ مطلب یہ کہ خیر و شر کی جنگ دنیا کے ہر دور میں چلی آئی ہے چنانچہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی (اقبال)

میرے تربت پہ ہوئے حلقہ نشیں نوحہ گراں
دلبراں، زہرہ وشاں، گلبدناں، سیم براں

قافلہ لالہ و گُل کا ہے چمن میں آباد
آئے کس شہر سے اس شان کے خونیں جگراں

ڈھونڈ مکتب میں نہ فرزانگی و ذوقِ سلیم
خالی اس بادے سے ہے کارگہِ شیشہ گراں[1]

عقل کا نُور بنا درسِ حکیمانِ فرنگ
نُور دل کا ہے مگر صحبتِ صاحب نظراں[2]

وُہ سُنا نغمہ کہ ہو تیری ہی اپنی تخلیق
کب تلک لب پہ ترے ہوگی نوائے دگراں

میری قیمت سے ہوا کوئی نہ اِس جا واقف
مَیں وہ گوھر ہوں کہ ہو دستِ زدِ بے بصراں[3]

---

[1] مکتب کو "کارگاہِ شیشہ گراں" اس بنا پر کہا کہ دہاں عموماً نظری، منطقی، اور سطحی مسائل سے بحث ہوتی ہے، لہٰذا مکتب کا نظامِ معنوی شیشے کی طرح کمزور ہے۔ [2] صاحب نظراں: اہل اللہ لوگ، صاحب نور و معرفت ہستیاں۔ [3] بے بصراں: نااہل اور بے شعور لوگ جو نگاہ فن شناس سے محروم ہیں۔

فِکر گھڑتی ہے مری ہر دم خداوندے دگر
عقل کے ہر بند پر حاوی ہُوا بندے دگر

بر سرِ بام آکے تُو چہرے سے سرکا دے نقاب
مجھ سا دُنیا میں نہیں ہے آرزومندے دگر

دیدۂ بینا بھی مجھ کو باعثِ آزار ہے
بن گئیں نظریں ہی تیرے رُخ پہ روبندے[۱] دگر

اک نظر، اک خندۂ دزدیدہ[۲]، اک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبّت کیا ہے سوگندے[۳] دِگر

عشق پر ہے ناز مجھ کو جس کے دردِ ہجر نے
شوق سے تیرے لگایا دل کو پیوندے دگر

تاکہ نالے ہیں جری تر ہو نوائے مُرغِ بہار
سوز لے میرے حریمِ سینہ سے چندے دگر

۱ے روبند: نقاب۔ ۲ے خندۂ دزدیدہ: چوری چھپے کی ہنسی۔ یہ بھی حُسن کی ایک دلربا صنعت سمجھی جاتی ہے۔ ۳ے سوگند: قسم۔

چنگِ تیموری گیا، آہنگ ہے اس کا بجا
نغمے کر دے گا بپا سازِ سمرقندے دِگر

کعبے میں آنے نہ دے پیرِ حرم اقبالؔ کو
ہر دم اس کی آستیں میں ہے خداوندے دِگر

دیدۂ باطن سے ہے مجھ کو شکایت دگر
جلوہ فشاں جو تو ہوا، پردہ بنی مری نظر!
کوئی یہ مشتِ خاک کا نوریوں کو پیام دے
مشتِ غبار سے ڈرو، کیونکہ ہے خویشتن نگر[1]
مَیں تو یہاں بہار میں سوزِ نوا سے جل اُٹھا
میرے بدن کو آتشیں کر گیا نالۂ سحر

[1] خویشتن نگر : اپنا صحیح مقام دیکھنے والا، خودشناس ؛

سمجھے گا کیا مری نوا جو ہے خودی سے بے نصیب
اُس کا جہان ہے دگر، میرا جہان ہے دِگر
گلشنِ دہر میں ہُوا لالے کی مثل مَیں عیاں
اُس کی نظر کے تیر سے چاک ہُوا مرا جگر؟
زیست ہے خود جفا طلب زندہ دلوں کے دین میں
کعبے کو مَیں نہ جا سکا، کیونکہ تھی راہ بے خطر
لاکھوں ہی مجلسیں سجیں، اور ہوئیں بھی منتشر
بزمِ سرائے دہر میں، جس کا چراغ ہے قمر[1]
خاک سے اپنی کر بپا مردِ قوی و خود شناس
تجھ کو تو فرصت اتنی ہے۔ جیسے تبسّمِ شرر
تُو جو نہیں ہے بوالہوس تجھ کو بتاؤں ایک راز
کرتے ہیں پختہ عشق کو نالہ و آہِ بے اثر

[1] چراغِ قمر بذاتِ خود تغیّر و انقلاب کا ضامن ہے، کیونکہ وہ ہر روز جلتا اور بجھتا رہتا ہے۔

مَیں نے عجم کے قلب میں پھونک دی آتشِ کہن
نغمۂ شوق سے مرے خاکِ عرب ہے بے خبر

بزم میں اس عذر سے مَیں ڈھونڈتا ہوں آشنا
ہوں غزل گو اور سندیسا دے رہا ہوں دوست کا
خلوتِ جاناں میں، جس جا گفتگو بھی ہے حجاب
مَیں بیاں کرتا ہوں نظروں ہی سے دلِ کا ماجرا
تیرے نظّارے کی خاطر کر رہا ہوں اُس کو پاک
آنکھ کو مَیں دے رہا ہوں غسل جوئے اشک کا
مثلِ غنچہ گو مرے رستے میں تھے عُقدے بہت
شوقِ جلوہ گاہِ خور کے زور سے مَیں اُگ پڑا

۱؎ خور: مخفف خورشید کا۔ "جلوہ گاہِ خور" سے مُراد دنیا جو نورِ آفتاب سے روشن ہے۔

موج ہوں ، سیلِ حوادث ہے مرا سازِ وجود
بحرِ ہستی میں سدا ہیں دُور ساحل سے رہا
اُس[1] کا میرا رابطہ چشم و نظر کی مثل ہے
عین دُوری میں بھی ہوں اُس سے قریب و باوفا
آنکھ کے پردے پہ کھینچی اُس نے تصویرِ جہاں
میری ہستی ہے نمونہ کس کے زورِ سحر کا
گنبدِ دربستہ[2] اُس کا میری وسعت پر تھا تنگ
آسمانِ کہنہ کا ئیں خارِ پہلو ہو گیا
ئیں نہ ٹھہرا آشیاں میں لذّتِ پرواز سے
گاہ ندّی کے کنارے ، گاہ شاخِ گُل پہ تھا

---

[1] "اُس" کی ضمیر کا مرجع ہستیٔ باری تعالیٰ ہے ۔
[2] گنبدِ دربستہ : وہ گنبد جس کا دروازہ بند ہے ، مراد آسمان ۔

اُٹھ ذرا بے نقاب کر پردگیانِ ساز کو
نغمۂ نو کا دے جنوں مُرغِ نواطراز کو

جادہ بھی خونِ عشق سے تختۂ لالہ بن گیا
لُوٹ کے کون لے گیا قافلۂ نیاز کو؟

تُو نے چمن میں کھول دی اُس کی جو چشمِ خوابناک
رُخصتِ یک نظر بھی دے نرگسِ نیم باز کو

بات تمھارے راز کی بچّوں کے لب پہ آگئی
میرا پیام جا کے دو خلوتیانِ راز کو

کفر بھی تیرے سجدوں پر کہتا ہے حرفِ الاماں
اے کہ دراز کرتا ہے پیشِ بشر نماز کو

گو ہے نگاہِ عقل میں عشق حقیر و کم بہا
لے کے نہ تختِ جم بھی دوں آہِ جگر گداز کو

سلہ پردگیانِ ساز : ساز میں چھپے ہوئے نغمے ۔

کہتا تھا غزنوی سے یہ ایک برہمنِ جری
توڑے صنم، نہ کر سکا زیر مگر ایاز کو!

بندگانِ شاہ پر میں فاش کرتا ہوں یہ راز
اک جہاں تسخیر کرتی ہے نوائے دل گداز
ساز و ساماں پر نہ ہو نازاں کہ شہرِ عشق میں
غزنوی کو بھی نہیں لیتا کوئی دے کر ایاز
ہے وہ نازِ بے نیازی پیکرِ صبر و غنا
شاہ کو بھی مات کرتا ہے گدائے بے نیاز
ہوں طلسمِ دل کا قیدی، پوچھ مت میرا مقام
ہیں یہاں میرے لئے یکساں، ہو پستی یا فراز

چھوڑ دانش، واصلِ محبوب ہو سکتے ہیں یوں
ایک قلبِ منفعل ہو اک نگاہِ پاکباز

تیری راہِ جستجو میں ناتمام و خام ہوں
دل میں کب شعلے اُٹھائے گی یہ چشمِ نیم باز؟[1]

تختۂ گُل بن گئی سجدوں سے میرے راہِ دیر
عشق کی وسعت دکھا سکتی نہیں میری نماز

جنگِ حسن و عشق کا تجھ کو بتاؤں کیا مآل
دِل بہانہ سوز ہے، لیکن نظر ہے عذر ساز

دست بر چنگ یہاں ساقیٔ گُل رنگ ہے آج
رنگ و نکہت سے چمن غیرتِ ارژنگ[2] ہے آج

[1] چشمِ نیم باز: آدھی کھلی ہوئی آنکھ جو عشاق کے نزدیک حسن کی ایک دلکش ادا ہے۔ اسی موضوع پر ایک شعر یاد آیا ؎

ہے چشمِ نیم باز عجب خواب ناز ہے — فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

[2] ارژنگ: معلوم کے شہرۂ آفاق مصوّر مانی کے تصویر خانے کا نام ارژنگ تھا؛

اُس کی رگ رگ سے اُمنڈ آیا ہے کیا خونِ بہار
لالہ زینت کے لئے تشنۂ صد رنگ ہے آج

نغمۂ مُرغ نے جذبات کو بخشی پرواز
جامۂ الفاظ کا معنی کے لئے تنگ ہے آج

عشق کی آنکھ سے کر شاہدِ فطرت کو تلاش
یہ جہاں عقل کو اک دفترِ[1] نیرنگ ہے آج

عشق سے درسِ عمل لے کے جو چاہے کر جا
عشق ہی رُوحِ فرد، جوہرِ فرہنگ[2] ہے آج

ماورا چرخ سے منزل ہے ہماری اے دوست
مہر بھی راہ میں اک تودۂ[3] فرسنگ ہے آج

کود کر بحر میں موتی نہ بنا اے قطرے!
لوحِ قلزم کے لئے نام ترا ننگ ہے آج

---

[1] دفترِ نیرنگ: وہ دفتر جس میں قدرت کی رنگا رنگ گلکاری ہے۔ [2] جوہرِ فرہنگ: عقل و دانش کی رُوح۔ [3] تودۂ فرسنگ: یعنی فرسنگ کا نشان۔ [4] لوحِ قلزم: سمندر کی تختی۔

قدرِ گوہر ہے نظر سے تری غافل، ورنہ
ارتقا پر بھی گہر اصل میں اک سنگ ہے آج

~~~~~

صورت کو نہیں پوجا، بُت خانے کو توڑا ہے
وہ سیل ہوں مَیں جس کا ہر بند پہ حملا ہے
تھا میری ہی ہستی پر اندیشے کو اک شک سا
ہے عشق سے یہ ثابت ہستی مری پیدا ہے
کعبے میں نمازیں ہیں اور دیر میں بھی سجدے
زنّار بھی رکھتا ہوں، سبحے سے بھی رشتا ہے
میں مایۂ غم تیرا غارت نہیں کر سکتا
جو دِل سے اُٹھا آنسو، وہ آنکھ میں توڑا ہے
~~~~~

گفتار میں فرزانہ، دیوانہ عمل میں ہوں
ہوں مست تری مے سے، اور ہوش بھی پایا ہے

ہوائے فرودیں[1] نے کر دیا گلشن کو میخانہ
سبو غنچے سے برسایا، کیا ہے گُل کو پیمانہ
محبّت جب جواں ہوگی، رقابت خود فنا ہوگی
سرِ شعلہ ہے گرمِ بزم پروانے سے پروانہ
عجائب کارِ سوز و سازِ ہستی کے تماشے ہیں
کبھی ہے درد سے مضطر، کبھی ہے لے سے مستانہ
چکوروں سے بھی آخر لرزہ بر اندام ہوتا ہے
قفس میں جب کسی شاہیں بچے کی ہو غذا دانہ

[1] ہوائے فرودیں: موسمِ بہار کی ہوا۔

کہو اقبال سے۔ بستر اُٹھا لے چھوڑ دے گلشن
کہ یہ جادو نوا کر دے گا ہم کو گُل سے بیگانہ

میر اسلام دے دو اُس ترکِ تند خو کو
جس کی نظر نے پُھونکا اک شہرِ آرزو کو
اک دردمند دل ہی اِس نکتے سے ہے واقف
گوئیں نے توبہ توڑی۔ توڑا نہیں سبو کو
گُل کی وفا تو بُلبل سو بار تو نے پرکھی
لیتی ہے پھر بغل میں کیوں اِس رمیدہ[1] بُو کو
تیری بقائے ہستی ہے سربسر تپش میں
قلزم میں جا کے سونا ہے موت آبجو کو

[1] رمیدہ بو: جس کی خوشبو ذرا اُڑ جانے والی ہو۔

عاشق کے دل کو تُو نے سوزِ دوام بخشا
درماں کی دی نہ تسکیں آزارِ جستجو کو

تُو نے کہا، کہ مت ہل۔ بالا خیال سے ہوں
اک عذر تو دیا ہے اشکِ بہانہ جو کو

نالوں سے گلستاں میں اک حشر کر دے برپا
ہاں۔ دم میں دم ہے جب تک مت چھوڑ ہاؤ ہُو کو

تُو نے ہر ہر خار کو مجھ سے پریشاں کر دیا
لے گیا دشتِ جنوں میں اور رُسوا کر دیا

جُرم میرا ایک دانہ، قہر اُس[1] پر سجدے سے
اِس طرح دونوں ہی کو تُو نے پرایا کر دیا

[1] اُس پر: یعنی شیطان پر۔

سُو جہاں کرتی ہے پیدا مثلِ گُل کشتِ خیال[1]
تُو نے اک ہی دہر میں خُونِ تمنّا کر دیا
عکس تیرے حُسن کا چھنتا ہے اُس سے مثلِ رنگ
صورتِ مے تُو نے مینا[2] ہی کو پردا کر دیا

ڈال دے اک طرحِ نَو، ہم ہیں یہاں جدّت پسند
یہ عیاں کیا جادوئے امروز و فردا کر دیا

وہ ہے خوش بخت جس نے عقل کو مے سے جلایا ہے
مثالِ لالہ اپنے دِل ہی سے شعلہ اُٹھایا ہے
تُو خود بھی ساغرِ صہبا سے چہرے کو گلستاں کر
فنِ خرقہ فروشی اِس نے صوفی کو سکھایا ہے

---

[1] کشتِ خیال: خیال کی کھیتی۔ [2] "مینا" سے مراد ہے کائنات۔ مطلب یہ کہ دنیا حسنِ باری تعالیٰ کی مظہر ہے۔ غالب بھی اِسی مفہوم کی ترجمانی کرتا ہوا کہتا ہے: ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

فقیہِ کعبہ کی محرومیوں پر خوں ہے دِل میرا
عوض فتوے کے جامِ مئے مُغاں نے کب لُٹایا ہے
نوائے بے اثر میری نہیں معیارِ موسیقی
کہ برقِ نغمہ نے ملکِ سکندر بھی جلایا ہے

صبا! امیر اسلامِ شوق دے ویمر[1] کے گلشن کو
کہ اُس کی خاک سے چشمِ خرد نے نُور پایا ہے

آ، ہمارے ذوق پہ ہے چرخ گردش کر رہا
مثلِ غنچہ شاخ سے اب نغمے ہوتے ہیں بپا
شیخ کی یادِ تنک[2] نوشی میں پیتا ہوں شراب
رازداں رندوں ہی میں صہبا کو جس نے چکھ لیا

---

[1] ویمر: جرمنی کا وہ معمورہ جس میں گوئٹے مدفون ہے۔
[2] تنک نوشی: تھوڑی شراب پینا۔

اس پہ رحمت کی بارش، جس کا یہ ایمان ہے
زندگی کی مشعلِ رہ جلوہ ہے اُمّید کا

دوستوں کے حوصلے سے تھی نوا میری بلند
مَیں تو گویا شہرِ خاموشاں[1] میں تھا نغمہ سرا

مشتری[2] کے ذوق کا ہے امتحاں جنسِ سخن
خوش ہوں میری جنس کا گاہک نہیں پیدا ہُوا

شعر سے اقبالؔ کے ثابت ہے یہ شے صاف صاف
عشق ہی کے پردے میں وہ درسِ حکمت دے گیا

تیر، نیزہ، خنجر اور شمشیر کی ہے آرزو
جا کہ مجھ کو مسلکِ شبّیرؔ[3] کی ہے آرزو

---

[1] شہرِ خاموشاں: مراد بے حس، تنگ ظرف اور کم حوصلہ لوگ
[2] مشتری: گاہک۔ [3] شبّیرؔ: حسین علیہ السّلام۔

خس فراہم کر رہا ہوں آشیانے کے لئے
ساتھ ہی اک شعلۂ[1] درگیر کی ہے آرزو!

وہ لگے کہنے ہمارے راز کو افشا نہ کر
مَیں یہ بولا نعرۂ تکبیر کی ہے آرزو

وہ لگے کہنے کہ جو جی چاہے۔ ہم سے مانگ لے
مَیں یہ بولا جلوۂ تقدیر کی ہے آرزو

اِس قدر ہے یاد مجھ کو زندگی کی رُوئداد
خواب اک بھولا ہوں مَیں تعبیر کی ہے آرزو

جس نے چھینا تھا مرا دل، اُس نظر کو کیا ہُوا
مجھ کو اے دلدار! ویسے تیر کی ہے آرزو!

[1] شعلہء درگیر: اندر تک جلا دینے والا شعلہ ہے۔

دانۂ تسبیح کو زنّار میں لا کر دکھا
دو نظر آئیں تو اپنی آنکھ پر پردہ گرا
قیدِ غنچہ سے نکل، آزاد ہو مثلِ شمیم[1]
مِل کے پھر بادِ صبا سے کھا زمانے کی ہَوا
بد نصیبی سے اگر تُو شبنمِ بے مایہ ہے
کر ذرا پرواز، خود کو لالے کے دِل پر گرا
تجھ کو فطرت نے اگر خارِ گُلِ نَورَس کیا
پاس کر گلزار کے ناموس کا، چُبھ کر دکھا
شاخِ گلبن سے اگر توڑے کبھی گلچیں تجھے
سبزے کی صورت دوبارہ خود کو مٹّی سے اُگا
کہنہ تر اور پختہ تر ہو عِلّتِ خُمخانہ میں
سوز و تلخی سے تری تا اک قیامت ہو بپا

[1] شمیم: خوشبو۔

بال و پرِ غیروں کے تجھ کو دیں سہارا کب تلک
اِس چمن میں خود کو تُو اپنے پروں ہی سے اُڑا

کھٹکھٹایا جب درِ بُت خانہ ، بولا مُغبچہ
شعلہ برپا کر حرم[1] میں اور وہیں دُھونی رما

دِل ہی سے اُٹھا شعلہ ، جو دل میں نہیں پیدا
غیروں سے نہ کر جا کے تجلّی کا تقاضا
مصرع یہ نظیری کا ہے بہتر دو جہاں سے
گُشتہ جو نہیں دوست کا ، مَحرم[2] نہیں میرا
میدان میں گو عقل نے لا پھینکے ہیں لشکر
مایوس نہ ہو ، عشق نہیں بے کس و تنہا

---

[1] حرم : کعبہ ۔ یعنی بُت کدہ میں کافر نے بھی مجھ سے کہا کہ ہرجائی نہ بن ، کعبہ سے بادفارہ ، اور اپنے عقیدے کو رُسوا نہ کر ۔ بالکل وہی بات ہوئی کہ :

گلۂ جفائے وفانما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کبھی بُت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

[2] محرم : رازدار

نغمات کی اقسام سے تو آپ ہے جاہل
کس نغمے سے معمور نہیں سازِ سلیمیٰ؟

محبوب کے جلوے ہیں دو عالم پہ ضیاریز
مَیں حُسن میں اپنے ہوں مگر غرقِ[1] تماشا

آ، شہر میں ہم نیند کے ماتوں کو جگادیں
اُس حُسن[2] کے دیوانوں کا مسکن نہیں صحرا

جا، ہم کو سُنا آ کے نہنگوں کی حکایات
مت کہہ مری کشتی نے تو دیکھا نہیں دریا

جو مرد ہے، اُس راہ پہ ہرگز نہ چلے گا
جس راہ سے ہر لحظہ نہ خطرات ہوں برپا

بندہ ہو تو اُس کا کہ ہے طوفان بآغوش
اُس سے ہو گریزاں جو نہیں صاحبِ غوغا

۱؎ یعنی میں اپنی "خودی" کے حُسن میں اس قدر مستغرق ہوں کہ حسنِ دوست دیکھنے کی فرصت بھی نہیں؛
۲؎ یعنی حُسنِ الٰہی کے شیدائی کبھی بیگانۂ ہوش ہو کر جنگل میں گوشہ نشین نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ رہبانیت ہے اور اسلام میں ممنوع؛

جو خام ہے، تقریر کی شورش پہ فدا ہے
جو پختہ ہے کر دے گا فقط ایک اشارا

دمِ ہر موج کو دریا کے سینے سے جدا کر دیں
جو ہم چاہیں تو اپنی نہر کو بحر آشنا کر دیں
اگر چاہیں تو خونِ شہرِ دل کر دیں نواؤں سے
صبا سے باغ کے پھولوں میں اک محشر بپا کر دیں
کریں جبریل[3] کو چاہیں تو اک کنجشکِ دست آموز[1]
اور اُس کے بال و پر کو مو[2] سے قید و بے نوا کر دیں
سکندر! سلطنت ہے شیشۂ صہبا سے نازک تر
اگر جمہور چاہیں، ضرب سے عالم فنا کر دیں

۱۔ کنجشکِ دست آموز: ہاتھ کی سدھائی ہوئی چڑیا۔ ۲۔ مو: بال۔ ۳۔ یعنی جبرئیل بھی ہماری بلندیٔ پرواز کے سامنے اس قدر بے بس ہو کہ ہم اُسے ایک بال ہی میں قید کر لیں۔

جو ہم محکم ہیں، پھر کیا خوف ہے سیلِ حوادث کا
گہر کی مثل دریا میں بپا اپنی سبھا کر دیں

گدائے کفر ہونے سے تو بہتر موت ہے غافل
یہ ہستی قرض ہے، آ خون ہی دے کر ادا کر دیں

نالۂ شب گیر ہے، صبحِ بلا انگیز ہے
سیکڑوں آہوں کا حاصل شعرِ دل آویز ہے
آ بتاؤں مَیں تجھے عشق و ہوس کا امتیاز
وہ ہے ضربِ کوہکن، یہ حیلۂ پرویز ہے[1]
پست و ناکارہ نہ سمجھو مجھ کو تم اے نوریو!
ذرّہ ذرّہ گرد کا میری بلا انگیز ہے

---

[1] عشق ایسا جری ہے کہ ضربِ فرہاد کی طرح پہاڑ بھی شق کر دے، مگر ہوس کی پرواز محض پرویز (رقیب فرہاد) کے مکر و فریب تک ختم ہو جاتی ہے۔

مطرب و ساقی سُنا سکتے ہیں کیا نغمے مجھے
بہرِ دل بلبل کا نغمہ ہی قیامت خیز ہے
کیا خبر، ہوں دہر سے کس نوع کے فتنے بپا
عصرِ نو کا ہر عمل ہنگامۂ چنگیز ہے

اے مغنّی! پیرِ رُومی کی سُنا دے اک غزل
دل کو اب مرغوب بزمِ آتشِ تبریز ہے!

سُرمے سے تاب دے پھر چشمِ کرشمہ زا کو
ذوقِ جنوں عطا کر شوقِ غزل سرا کو
اک حشر خیز آدم فطرت سے کر نمایاں
بُت خاک کا بنانا، زیبا نہیں خدا کو

کہتا ہے تُو کہ مت کہہ دردِ جگر کسی سے
آخر کہاں چھپاؤں اِس محشرِ نوا کو
وُہ عشق اب کہاں ہے جو دِل کو طُور کر دے
برباد کر رہا ہوں عقلِ گرہ کُشا[1] کو!
کر عیش دشت و در میں اور چھیڑ سازِ نغمہ
مے پی کے ہو غزل خواں اور چاک کر قبا کو
سامان باندھ کر وہ جانا ہے کارواں بھی
تُو نے نہیں سُنا کیا آوازۂ درا کو؟

مَیں شاہ کے کرم سے نادم نہیں جہاں میں
دیکھ اے ہوس کے بندے! خودداریٔ گدا کو

---

[1] عقلِ گرہ کشا: وہ عقل جس سے دقیق مسائل کے حل کی توقع تھی، مگر حل نہ ہوئے۔
[2] آوازۂ درا: گھڑیال کی آواز
[3] منفعل: شرمندہ۔

ہے فریبِ عقل و دانش اس جہاں میں دیدنی[1]
کارواں کے میر میں بھی دیکھ شوقِ رہزنی!

عقل حیلہ ساز ہے خود ہی، بتائے راہ کیا؟
عشق کو رہبر بنا، اُس میں ہے شانِ یک فنی!

خطۂ افرنگ انجم سے ہے گو محوِ کلام
الحذر! کردار میں اُس کے ہے رنگِ جوزنی[2]

دہر میں کرتا ہے مرگ و زیست میں کیا امتیاز
زیست میں ہے کاہشِ جاں، مرگ میں ہے جاں کنی!

کھینچ لے باگیں ذرا خاکِ شہیداں پر ندیم
بے زبانی تا کہ لے ایک حرفِ گفتنی[3]!

خیمہ زن دشتِ عرب میں ہو کہ اب بزمِ عجم
جام و مے سے ہے تہی اور چھا رہی ہے مُردنی!

---

[1] دیدنی: قابلِ دید: قابلِ غور۔ [2] رنگِ جوزنی: جادو گر کا سا عمل جس میں کوئی ٹھوس حقیقت نہیں۔ شعبدہ بازی۔ [3] حرفِ گفتنی: ایک بات جس کا کہنا نہایت ضروری ہے یعنی شہیدانِ حق باوجود بے زبانی ہمیں کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔ اور وہ پیغام اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ بقائے اسلام کے لئے اپنی جان تک دینے سے گریز نہ کرو!

شاعرِ و مُلّا و صُوفی مت سمجھ اقبالؒ کو
وہ فقیرِ رہ نشیں ہے قلب اُس کا ہے غنی

میرے ذوقِ دید کا مرکز ہے وہ ماہِ تمام
ہاتھ سینے پر ہے میرے اور نظر بالائے بام
حُسن بولا شام کی ممنوں نہیں میری سحر
عشق بولا مجھ کو حاصل ہے تب و تابِ دوام
توڑ ڈالے عشق نے امروز و فردا کے صنم
ہے یہاں پستی بلندی اور نہ ہے قیدِ مقام
مَیں شرابِ راز ہوں، ہے رند کی مجھ کو تلاش
کر رہا ہوں گردشیں میخانے میں مانندِ جام

میری شوریدہ نوائی سے نہ رہ تُو بے نیاز
مُرغِ لاہوتی ہوں مَیں، جو یار کا لایا پیام

مجھ سے در پردہ سُنو افسانہ ہائے خوں چکاں
تیغ ہوں، لیکن مَیں رکھتا خود کو ہوں زیرِ نیام

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

مرے عروج کا زینہ ہے ذوقِ تشنہ لبی[1]
تلاشِ چشمۂ حیواں دلیلِ کم طلبی!
حدیثِ درد سُناؤں مَیں کس کو دُنیا میں
عبث ہے آہ یہاں اور نگاہ بے ادبی!
غزل کے شعر بھی دھیمے سُروں میں گا غافل
ابھی ہے نالۂ مُرغاں نوائے زیرِ لبی

---

[1] تشنہ لبی: پیاس، مراد شوقِ جستجو ہے
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

مُتاعِ قافلہ لُوٹی ہے گو حجازی نے
زبانِ شکوہ نہ کھولو کہ یار[1] ہے عربی

نہالِ ترک ثمرور ہے برقِ مغرب سے
ظہورِ مصطفوی کا بہانہ بولہبی!

مرے معانی کو معیارِ ہند پر نہ پرکھ
ہے اِس گُہر کی جِلا گریہ ہائے نیم شبی

جو پی ہے مَیں نے خُمِ رُوم[2] سے شرابِ دوام
مرے کلام سے نادم ہے بادۂ عنبی[3]

ہیں عشق کی نظر دل میں اک کعبہ و بُتخانہ
یہ جلوتِ جانانہ، وہ خلوتِ جانانہ!

---

[1] "یار" سے مراد نبی کریمؐ کی ذاتِ بابرکات ہے۔ [2] خُمِ رُوم سے مراد ہے مثنوی مولانا جلال الدین رُومیؒ، جو تصوّف و معرفت کے عناصر سے بدرجۂ اتم معمور ہے۔ [3] بادۂ عنبی: انگور کی شراب۔

مرنے پہ بِلی خاکِ دیوارِ حرم مجھ کو
لا ڈالوں گا آنکھوں میں اب کعبہ و بُت خانہ

ہیں بزمِ جہاں سے خُوب اور حُور و جناں سے خُوب
لبریز دو پیمانے۔ اک ہمدمِ فرزانہ

ہر شخص نظر لایا، ہر شخص سخن لایا
محفل میں تری نکلا افسانے سے افسانہ

ہر قلب کی تسکیں پر حملہ یہ کیا کس نے؟
صد شہرِ تمنّا کو لُوٹا بھی ہے ترکانہ!

اِس دشتِ جنوں میں ہے اِک صیدِ زبوں جبریلؑ
کر صید تو یزداں کو اے ہمّتِ مردانہ!

"اُس" راز کو منبر پر اقبالؒ نے کہہ ڈالا
ناپختہ نکل آیا ساغرِ مے خانہ

عدم سے بے ترے دنیا میں آیا جا نہیں سکتا
فراقِ یار میں ہستی کو پایا جا نہیں سکتا

ہمارا دل جہاں میں یا جہاں دل میں ہمارے ہے
زبان و عقل سے یہ راز پایا جا نہیں سکتا

خفا احباب ہیں میری نوا ہائے پریشاں سے
میں اس نغمے سے بسمل ہوں جو گایا جا نہیں سکتا

تو اے بادِ صبا ضائع نہ کر شبنم کے چھینٹوں کو
دلِ لالہ کے شعلوں کو بجھایا جا نہیں سکتا

خدا سے دِل لگا، مخلوق کا سائل نہ ہو ناداں
جبیں کو بُت کی چوکھٹ پر جھکایا جا نہیں سکتا

یہ وسعتِ افلاکی، یہ پستی و بالائی
اک دل میں سمائی ہے با ایں ہمہ پہنائی[1]

اسرارِ ازل چاہے، اپنے پہ نظر وا کر
یکتائی و بسیاری! پنہانی و پیدائی!

اے جان تو سمجھی بھی مفہومِ محبت کو؟
جب سینے میں گھبرائی، آنکھوں سے نکل آئی!

روشن ہے بہاروں سے ہر سمت چراغِ گُل
اُٹھ اور سجا محفل با لالۂ صحرائی!

ہے عشق ہزار افسوں اور حسن ہزار آئیں
ہوں میں بھی تو ہر جائی، ہے تو بھی تو ہر جائی!

افلاک و زمیں ہی کی سازش نے مٹا ڈالیں
خاقانی و فغفوری، جمشیدی و دارائی!

۱؎ پہنائی: وسعت۔ ۲؎ پنہانی: پوشیدہ ہونے کی حالت۔ "پیدائی" ظاہر ہونے کی حالت
۳؎ یعنی جب محبت سینہ میں بے چین ہوئی تو بذریعہ اشک آنکھوں سے نکل آئی۔

مَیں اُس میں ہوں وہ مجھ میں، یہ وصل ہے یا فرقت
اے عقل مدد کر کچھ، اے عشق ہو یارائی!

ہے دل کا جمالستاں یوسفؑ سے بھی جاذب تر
عالم پہ نمایاں کر اِس حسن کی زیبائی!

(صوفیہ میں سے ایک کے نام تحریر کی گئی)[1]

(۱)

جہاں کے دشتِ وحشت زا میں شوقِ منزلِ لیلیٰ
شجاعت اور اولوالعزمی جو سہہ لے گرمئ صحرا ـــ
نہ مجھ میں ہے نہ تجھ میں ہے، تو پھر کیسا ہے واویلا؟

(۲)

تُو بن بیٹھا ہے گو پیرِ مغاں اور مَیں جواں ساقی
ابھی تک بزم ہے تشنہ، شعورِ خلقتِ صہبا[2] ـــ
نہ مجھ میں ہے نہ تجھ میں ہے، تو پھر کیسا ہے واویلا؟

---

[1] اِس نظم کے ہر شعر کا مَیں نے بطرزِ مثلث ترجمہ کر دیا ہے۔ ہر بند میں تیسرے مصرع کا اعادہ کیا گیا ہے کیونکہ وہ ردیفِ شعر "نہ تو داری و نہ من" کا آزاد ترجمہ ہے! [2] شعورِ خلقتِ صہبا: شراب بنانے کا فن ہے۔

(۳)

عجم کے مہ وشوں پر قلب و دیں ہم نے کیا قرباں
کنارہ کش عجم سے ہو کے شوقِ اُلفتِ سلمیٰ[1] —
نہ مجھ میں ہے نہ تجھ میں ہے، تو پھر کیسا ہے واویلا؟

(۴)

ہوس کے سنگ ریزے عمر بھر چُنتے رہے باہم
کمالِ دین و دانش کا جہاں میں جوہرِ یکتا —
نہ مجھ میں ہے نہ تجھ میں ہے تو پھر کیسا ہے واویلا؟

(۵)

ہمیں ہے آرزوئے یوسفِ گم گشتہ کا حق کیا
جہاں آشوب ہنگامہ وہی عشقِ زلیخا کا —
نہ مجھ میں ہے نہ تجھ میں ہے تو پھر کیسا ہے واویلا؟

(۶)

کریں گے صبر اب نُورِ چراغِ زیرِ داماں پر
تلاشِ حق میں توفیقِ شعارِ جلوۂ سینا[2] —
نہ مجھ میں ہے نہ تجھ میں ہے، تو پھر کیسا ہے واویلا؟

[1] سلمیٰ: ادبیاتِ عرب میں معشوقہ کا فرضی نام۔ [2] سینا: کوہِ طور۔

ہوں خضرِ راہِ تمنّا۔ نہ مجھ سے کر پرہیز
کر اپنی خاک مرے سوز سے شرر آمیز
عروسِ لالہ نے چھوڑا ہے آج حجلۂ[1] ناز
جلاؤں تجھ کو۔ ادھر آ۔ یہ حرفِ شوق انگیز
نئے طریق سے ہر دَور میں سناتے ہیں
حکایتِ غمِ فرہاد و عشرتِ پرویز
اگرچہ ہوں تو مَیں ہندی، فروغِ چشم مِرا
ہے خاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز

〰〰〰〰〰〰〰

میرے جہانِ دل میں دَورِ قمر[2] نہیں ہے
ہیں انقلاب لاکھوں۔ شام و سحر نہیں ہے
وہ کارواں ہی کیا جو خائف ہو رہزنوں سے
اُس راہ پر نہ چل تُو، جس میں خطر نہیں ہے
دریائے عشق میں آ۔ تہ سے نکال موتی:
جوئے خرد میں غافل کوئی گہر نہیں ہے

---

[1] حجلہ: وہ مقام جو دلہن کے لئے کمال اہتمام سے آراستہ و پیراستہ کیا جائے۔
[2] دورِ قمر: چاند کی گردش، مراد رات دن۔ یعنی میرے دل کی وسعت میں امتیازِ وقت فنا ہو جاتا ہے۔ دل میں اگر کوئی شے ہے تو بس ابد و دوام۔

ہم ڈھونڈتے ہیں جس کو صبح و مسا جہاں میں
وہ آنکھ میں ہے، ظاہر مثلِ نظر نہیں ہے!

گریہ ہے میرا بے اثر، نالہ ہے میرا نارسا
نغمۂ عشق کا ثمر ایک ہے آتشیں نوا
اُس کی طلب میں قلب نے دیر و حرم لئے بنا
مَیں ہوں اُسے بُلا رہا، وہ ہے مجھے بُلا رہا
حُسنِ خودی میں غرق ہوں، حُسنِ جہاں سے بےنیاز
عشقِ غیور تو نہیں غیر کے حُسن پر فدا
مطربِ میکدہ تھا کل نغمۂ راز گا رہا
بادے کا چکھنا ہے خطا، بادے کا کھینچنا[1] روا
ادجِ مسافراں تو ہے دہر کی دوڑ دھوپ میں
کب ہے مکان کا اسیر موجِ رواں کا قافلہ
تودۂ خس پہ میرے اک شعلۂ دِل گرا دیا
جب کہا پیرِ رُوم نے "جان ہے میری کبریا"

---

[1] "بادہ کشیدن" افراط سے شراب پینا۔ فرماتے ہیں کہ محض "بادہ چشیدن" (شراب کے چکھنے) میں ہرگز وہ لطف داثر نہیں جو بافراط شراب پینے میں ہے۔ یہاں شراب سے مراد ہے شرابِ معرفتِ حق۔

شعر کی جان ہے اک نالۂ مستانۂ دل
جلوہ اس شمع کا منت کشِ پروانۂ دل

مشتِ خاک اپنی ہے جوہر سے فغاں کے محروم
وجہِ شہرت ہے یہاں گردشِ پیمانۂ دل

ایک تاریک سرا جس کو جہاں کہتے ہیں
اس کا معمار بھی ہے تیرا صنم خانۂ دل

فلسفی محو ہے انجم میں جو ہر دم رہتا
وہ بھی ہے ڈھونڈ رہا سرحدِ ویرانۂ دل[1]

ہیں فرشتے بھی اسی دل کی نگاہوں میں اسیر
اور ہے صوفی ہدفِ شیوۂ ترکانۂ دل

بُت کدے توڑے ہیں محمود نے اکثر پھر بھی
وہ ہے پہنے ہوئے زنّارِ صنم خانۂ دل

مردِ مسلم سے زیادہ نہیں کوئی غافل
دل ہے سینے میں مگر پھر بھی ہے بیگانۂ دل

---

[1] یعنی دل اس قدر وسیع دنیا ہے کہ فلسفی کو بھی باوجود تحقیق اس کی انتہا نہیں مل سکی۔

کوہ کی سطوت یہاں کرتا ہے حاصل ایک کاہ
تاجِ جم کا مستحق بنتا ہے اک درویشِ راہ
کچھ نہیں راہِ محبت میں فلاں ابنِ فلاں
ہوتا ہے اِس جایدِ بیضا کا مالک اک سیاہ[1]
شاہ کو دیکھو تو ہے گا ہے گدائے بے نوا
تاج و تختِ مصر لیتا ہے کبھی محبوسِ چاہ[2]
فقر بھی پاتا ہے دُنیا میں جہانگیری کی شان
باعثِ تسخیر ہے اِس کے لئے تیغِ نگاہ

عشق پامالِ خرد ہے اور جہاں زیر و زبر
ہے بہت ممکن کہ بخشیں مجھ کو سوز و سازِ آہ

---

[1] سیاہ: حبشی غلام، جیسا کہ فی الواقعہ بلالِ حبشیؓ کو روحانیت میں یدِ بیضا حاصل تھا۔

[2] محبوسِ چاہ: کنوئیں کا قیدی، حضرت یوسفؑ سے مراد ہے۔ جو ایک وقت کے لئے کنوئیں میں مقید رہے۔ پھر تختِ مصر تک رسائی حاصل کی۔

تُو کعبے میں نہ گاہے جانبِ بُت خانہ آتا ہے
سُوئے عشّاق لیکن خُوب مشتاقانہ آتا ہے

حریمِ قلب میں آباد ہو جا آ کے جرأت سے
تُو صاحب خانہ ہے، پھر کس لئے دزدانہ[1] آتا ہے

تُو غارت کرتا ہے سرمایہ ان تسبیح والوں کا
مگر سُوئے دلِ زنّاریاں تُرکانہ آتا ہے

کبھی لاتا ہے فوجیں دوستوں کا خون کرنے کو
کبھی محفل میں لے کر شیشہ و پیمانہ آتا ہے

گِراتا ہے تجلّی کے شرارے نخلِ موسیٰؑ پر
سرِ شمعِ یتیماں[2] صورتِ پروانہ آتا ہے

---

[1] دزدانہ: چوری چھپے۔ [2] اس لفظ سے اشارہ مقصود ہے نبیٔ کریم کی جانب جو بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ مطلب یہ کہ کبھی تو موسیٰؑ کو بھی تجلّی پھینک کر بے ہوش کر دیتا ہے اور کبھی اتنا مشتاق و مہربان ہوتا ہے کہ شمعِ نبویؐ کی جانب خود پروانہ وار بھاگا آتا ہے۔

تو اے اقبال اک ساغر خمستانِ خودی سے پی
کہ مے خانے سے مغرب کے زخود بیگانہ آتا ہے

مفقود ہے عجم میں سوز و گداز میرا
اُن[1] کی اک نظر نے چھینا حجاز میرا
عقلِ بہانہ جو سے مَیں غرقِ کشمکش ہوں
توڑے گی آنکھ تیری[1] سحرِ مجاز میرا
یہ عقل بُت کدہ ہے، دل ہے حریمِ کعبہ
پھونکے گا فلسفے کو سوز و گداز میرا

تیری نظر نے اُس کو رُسوا کیا جہاں میں
ورنہ ازل سے دل میں پنہاں تھا راز میرا

[1] یعنی نبی کریمؐ کی چشمِ حقیقت اثر ؂

مثلِ آئینہ نہ ہو محوِ جمالِ دگراں
دل سے اور آنکھ سے دھو ڈال خیالِ دگراں

آتشِ نالۂ مُرغانِ حرم سے تو جلا
آشیاں باندھا جو بالائے نہالِ دگراں

دہر میں سیکھ پر و بال سے اپنے اُڑنا
اُڑ نہیں سکتا کوئی با پر و بالِ دِگراں

مردِ آزاد ہوں، اتنا ہوں غیور و خوددار
زہر ہے میرے لئے جامِ[1] زلالِ دگراں

رُوح میں ہو کے مکیں تو ہے نظر سے پنہاں
ہجر بہتر ترا، بدتر ہے وصالِ دگراں

[1] جامِ زلال: ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا پیالہ۔

جہانِ عشق نہ میری نہ سروری[1] جانے
یہی بہت ہے کہ آئینِ چاکری[2] جانے

یہ کیا ضرور ہے جو پیشِ بُت کرے سجدہ
صنم پرستی و آدابِ کافری جانے

ہزار خیبر و صد گونہ اژدہا ہیں یہاں
نہ جو بھی نانِ جویں کھائے، حیدری جانے

نگاہِ عشق میں ممتاز ہے سکندر سے
وہ اک گدا کہ مآلِ سکندری جانے!

ادا و نازِ بُتاں پر فدا نہ کر دِل کو
مُرید پیر ہو، جو رازِ دلبری جانے

فرنگ اگرچہ ہے شیشہ گری میں سب کا امام
مگر یہ کیا ہے کہ شیشے کو وہ پری[3] جانے!

---

۱ سروری : آقائی ، مالک و سردار ہونا ۔ ۲ چاکری : خدمت و اطاعت ۔
۳ پری : مراد شراب ۔

یہ ہے مثالِ مسلمانِ نامسلماں کی
پسرِ خلیلؑ کا آئینِ آذری جانے

مرے خرابے کو آ دیکھ اور کر تسلیم
یہ قلبِ سوختہ بھی کیمیاگری[1] جانے!

تُو آ کے بزم میں اقبالؔ کی ہو ساغر نوش
وُہ سر کو گو نہ تراشے، قلندری جانے

کوئی خواجہ نہیں، جو اس کا پرستار نہیں
کوئی بندہ نہیں، جو اُس کا خریدار نہیں
طُور[2] کا قصہ بیاں کرتا ہے واعظ ہرچند
حاملِ ضَو مگر آئینۂ گفتار نہیں!

۱۔ کیمیاگری: سونا بنانا، مراد اصلاحِ قلوب کرنا۔
۲۔ یعنی واعظ کی تقریر میں قصۂ طور کے باوجود طور کا سوز و نُور مفقود ہے۔

پیر نے بہرِ حقیقت ہی لیا رنگِ مجاز
حُسن والوں سے اسے کوئی سروکار نہیں

حق ہے مقصود تو کر خرقہ فروشوں سے گریز
نفس کا بندہ کبھی حق کا طلبگار نہیں

قلب سے میرے نہ ہو رنگِ طرب کا خواہاں
نغمۂ عیش کا اِس ساز میں اک تار نہیں

یوں تو مرغوب ہمیں کفر کے ہیں رسم و رواج
لیکن اعمال ابھی قابلِ زنّار نہیں!

صحبتِ میکدہ میں عشق ہے گوہر افشاں
کیونکہ کعبے میں کوئی محرمِ اسرار نہیں

۱؎ یعنی اہلِ کفر کے تمدّن کو دوست رکھنے کے باوجود ہمارے اعمال میں کفر سے بھی وفاداری کی جھلک نہیں پائی جاتی ۔ حاصل یہ کہ عقائد کی دنیا ہر رنگ میں متزلزل ہے ۔

آ- کہ بلبل جوشِ مستی میں نواپرداز ہے
اور عروسِ لالہ گلشن میں سراپا ناز ہے
پردۂ غیبی ہے منبع نغمہ ہائے شوق کا
تُو غلط سمجھا کہ شعروساز کی آواز ہے
تارِ ہستی پر لگایا جس نے زخمہ عشق کا
بس اُسی انسان کا دِل آشنائے راز ہے
جتنے بھی اسرارِ دُنیا میں ہیں، روشن مجھ پہ ہیں
مَیں مگر خاموش رہتا ہوں، فلک کج باز ہے
تلخ گوئی سے حذر کر، رسمِ یاری کو بڑھا
میری تیری صحبتیں ؟ یہ چیز مولا ساز ہے
کوئی منزل بھی ہے تیرے خاکدانِ[1] تیرہ کی؟
اِس جہاں کا ذرّہ ذرّہ مائلِ پرواز ہے!

[1] خاکدانِ تیرہ : یہ دُنیا جو اوہام سے تاریک ہو رہی ہے۔

تن مرا اک پھول سمجھو جنّتِ کشمیر کا

دل حجازی ہے، نوا آئینۂ شیراز ہے

خاکی ہوں، تُند سیر[1] مثال ستارہ ہوں

بیٹھا ہوں بحر میں بتلاشِ کنارہ ہوں

بود و نبود میری ہے اک شعلۂ حیات

غرقِ خودی ہوں، مثلِ شرر پارہ پارہ ہوں

اے نوریو! یہ شان ہے عقلِ بلند کی

ہوں خاک اور بدوشِ ثریّا سوارہ ہوں

ہوں بزم میں وہ غنچہ صبا سے جو کانپ اُٹھے

اور کارزار میں صفتِ سنگِ خارہ ہوں

[1] تند سیر: تیز رفتار؛

میں نے چمن میں پائی ہے نرگس کی چشمِ مست
رُخ سے نقاب اُٹھا کہ سراپا نظارہ ہوں

عرب مرے اشکِ خوں سے اب تو جہاں میں اک لالہ زار ہوگا
عجم کی بے جاں زمیں کو میرا نفس ہی بادِ بہار ہوگا
تپش سے فانی بھی جاوداں ہے تپش سے ہے زندگی کی رفعت
مرے بدن کا ہر ایک ذرّہ یہاں دلِ بے قرار ہوگا
سفر میں منزل سے ہے گریزاں حضر میں محروم ہے سکوں سے
دلِ مسافر کا یار ہوگا تو ایک پروردگار ہوگا
کمال جب بھی خرد نے پایا، بنائے سب نقشِ نامرادی
یہ ساز وہ ہے، سرود کے وقت بے صدا جس کا تار ہوگا

ترا تاثر ہے حسام اب تک مرا سخن برقِ بے محابا
تو سوز میری غزل کا کیسے تجھے یہاں ساز گار ہوگا

تُو میرے سینے میں جب سمایا تو تجھ کو یہ آرزو تھی لاحق
کہ تیری شبنم کا قطرہ قطرہ بھی اک یمِ بے کنار[1] ہوگا

قرار و تسکین نہ ہو میسّر تجھے زمانے کی کشمکش میں
دوامِ ہستی کا راز تجھ پر اسی طرح آشکار ہوگا

فکر و کردار میں تیرے ہے ابھی کوتاہی
تجھ کو درکار ہے ایمانِ کلیمِ الٰہی

کورہے راہ[2] تو خود غرقِ خودی ہو رہرو
راستہ کھوتی نہیں در تہِ دریا ماہی

[1] یمِ بے کنار: غیر محدود سمندر۔ [2] راہِ کور: پیچیدہ اور نامعلوم راستہ، تاریک راستہ۔

مردِ خوددار نہیں پیشِ سلاطیں سائل
کیا کروں، کوہ سے ممکن ہی نہیں ہے کاہی
قدر کر اُس کی، مرے شعر میں پائے گا تُو
رمزِ درویشی و سرمایۂ شاہنشاہی
مثلِ گُل تجھ کو کِھلا سکتے ہیں میرے انفاس
دردِ دل سے ہے مرے تجھ کو اگر آگاہی

آسماں! آنکھ ہے بے باک و بلاجُو تیری
رنگ لائے گی کوئی تیری تغیّر خواہی

تیرے بادہ سے ہے سرخوش دہر میں ہر خُم شکن
مست ہیں تیرے لبِ لعلیں سے سب شیریں سخن

خاص زینت تجھ کو دیتی ہے عرب ہی کی قبا
راست ہیں قامت پہ تیرے ورنہ جملہ پیرہن

ہیں لبِ لعلیں ترے خاموش لیکن چشم مست
خوش شدہ دل سے مرے رہتی ہے مصروفِ سخن

ہے مری بزمِ سخن کی رُوح تیرا ذکرِ خیر
ورنہ ہر خلوت مری ہوتی ہے رشکِ انجمن

اے مسلماں! اب ہوا اعجازِ سلیماںؑ کا امیں
ہے تری انگشتری کی گھات میں ہر اہرمن[1]!

اگرچہ تیرا گدا صاحبِ کلاہ نہیں
وہ اُس سے کم بھی کہاں ہے جو بادشاہ نہیں

[1] اہرمن: شیطان۔ مراد ہر کافر اور دشمنِ حق شخص۔

جواں خواب میں ہیں اور مردہ دل ہیں پیر
کسی کے سینے میں بھی آہِ صبحگاہ نہیں

اسی بہانے سے مت چھوڑ دے تُو دشتِ طلب
کہ عصرِ نو میں کوئی آشنائے[1] راہ نہیں

لگا کے وقت میں غوطہ نکال لا اِک بار
وہ دَور، جس میں کبھی قیدِ سال و ماہ نہیں

جہانِ پیر میں تجھ کو ہے عافیت مطلوب؟
فنا کی رمز پہ غافل تری نگاہ نہیں!

لکھیں گے کیا مرے عصیاں یہ کاتبانِ عمل
نصیبِ بندہ جہاں میں بجز نگاہ نہیں

چلو کہ دامنِ اقبال تھامیں، وہ خوددار
شریکِ خرقہ فروشانِ خانقاہ نہیں

[1] آشنائے راہ: راستے کے نشیب و فراز سے باخبر لیڈر؛

دل میں ہے شعلے دبائے عشق بے پروا مرا
ہے شرر سے بھی تہی اور اک حسرت زا مرا

جب نیازِ عشق کامل ہو تو بن جاتا ہے ناز[1]
قیس کو لیلےٰ بھی تو کہتا ہے صحرا مرا

ہند[2] سے لایا ہوں اُس کو تیری چوکھٹ کے لئے
خُون بن کر رہ گیا ماتھے میں جو سجدا مرا

تیغِ لَا کر دے عطا اِس کافرِ دیرینہ کو
پھر جہاں میں دیکھ لے ہنگامۂ اِلّا مرا

چاہتا ہوں اب تو مَیں گردوں کی ایسی گردشیں
عکس ریزِ دوش ہو آئینۂ فردا مرا

تیرے بحرِ نُور سے سارا جہاں ہے فیضیاب
اور تجلّی کو ترستا رہ گیا سینا مرا

---

[1] مطلب یہ کہ نیاز (عشق) بھی اپنی منازل طے کرتے کرتے آخرکار اُس مرتبے تک پہنچ جاتا ہے کہ سراپا ناز (حُسن) بن جاتا ہے۔ اِس مقام پر اُس کی حیثیت طالب کی نہیں بلکہ مطلوب کی ہوجاتی ہے۔ اقبالؔ کا مندرجہ ذیل شعر بھی اسی مفہوم کی وضاحت کرتا ہے :

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تُو نے اے مجنوں
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

[2] اِس شعر سے آخری شعر تک حضرت نبی کریمؐ کو مخاطب کیا گیا ہے ؛

اُس سے کہتا ہوں چھپا کر، تجھ سے لیکن آشکار

یا محمدؐ لب ہے خندہ پنہاں، تُو ہے پیدا مرا

صنم تُو نے کئے تازہ بپا، افسوس ہے تجھ پر

نہ دیکھی قلب کی اپنے جِلا، افسوس ہے تجھ پر

یہاں تک تجھ کو پگھلایا، فرنگی شعلہ سازوں نے

تُو اپنی آنکھ سے خود گِر گیا، افسوس ہے تُجھ پر

نگاہِ یار لے جاتی تجھے اوجِ ثریّا پر

نہیں خود ہوش ہی تیرے بجا، افسوس ہے تُجھ پر

یہ مانا، تُو نے دفترِ عقل کے سب دیکھ ڈالے ہیں

کتابِ عشق سے جاہل رہا، افسوس ہے تجھ پر

کیا تُو نے طوافِ کعبہ، گردِ دیر بھی گھوما

طواف اپنے نہ دل کا کر سکا، افسوس ہے تجھ پر

نقشِ فرنگ

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقشِ فرنگ

پیام

اے صبا لے جا مرا پیغام یہ سوئے فرنگ
جب سے پر کھولے خرد نے، وہ مقید تر ہوئی
عشق بجلی دل پہ لیتا ہے، خرد کرتی ہے رام
عقلِ پُر مکر و فسوں سے عشق ہے بڑھ کر جری

آنکھ نے دیکھا نہیں کچھ رنگِ گُل سے ماورا
ورنہ جو کچھ رنگ کے نیچے ہے، زائد ہے جلی[1]

کیا عجب حاصل جو اعجازِ مسیحا ہے تجھے
پا نہیں سکتا ترا بیمار حقِّ زندگی!

عقل کی تسخیر میں تُو نے کیا برباد دِل
کاش اِس گوہر کے کھونے پر تُو ہوتا منفعل[2]

فلسفہ ہے وہ سمندر جس کا کچھ پایاں[3] نہیں
عشق کی موجیں مگر اُس بحر میں رقصاں نہیں

مردمِ بیدار کو اکثر سُلا دیتا ہے وہ
کونسا فتنہ ہے جو اِس آنکھ میں رخشاں[4] نہیں

دِل نہیں پاتا حرارت اُس کے ٹھنڈے ناز سے
دردو سوزِ عشق اُس کے غمزے میں نہاں نہیں

---

۱ جلی: روشن۔ واضح تر۔ ۲ منفعل: شرمندہ۔ یہاں "پچھتانے والا" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔
۳ پایاں: انتہا۔ ۴ رخشاں: روشن۔

کوہ و صحرا میں پھرا وہ اور نہ پکڑا اک غزال[1]
ساکنِ گلشن کا دل اک گُل سے بھی شاداں نہیں

اب یہ چارہ ہے کہ پائیں عشق سے دل کی کُشاد
عشق کو سجدہ کریں، حاصل کریں اپنی مراد

جب رہِ پُر پیچ و خم میں عقل نے رکھّا قدم
شعلہ[2] پانی میں چلایا، اور جہاں برہم کیا

کیمیا سازی نے اُس کی ریگ کو دی شکلِ زر
قلب پر رکھا نہ پھایا اُلفت و ایثار کا

سادہ لوحی نے ہماری اُس سے کھایا ہے فریب
وہ تھا رہزن، کارواں کا سب اثاثہ لے گیا

خاک لی کچھ اُس نے اپنے خطّۂ تہذیب سے
چشمِ عیسیٰؑ میں اُسے ڈالا، کیا اُس سے ابا[3]

---

[1] غزال: ہرن۔ [2] شعلہ: مراد بحری جہاز اور آبدوزیں۔
[3] ابا: انکار، سرکشی۔

ایک چنگاری سے شعلوں کی تمنّا کب تلک؟
دِل کے عقدوں کو کرے آخر خرد وا کب تلک؟

عقلِ خود بیں ہے دِگر، عقلِ جہاں بیں ہے دِگر
بالِ بُلبل ہے دِگر، بازوئے شاہیں ہے دِگر
ہے دگر منقار، جو چگتی ہے دانہ خاک سے
اور فلک پر دانہ چینِ کشتِ[۱] پرویں ہے دِگر
ہے دگر وہ دِل کرے جو سیرِ گُل مثلِ نسیم
اور نگاہِ نقش بینِ قلبِ نسریں[۲] ہے دِگر
ہے دِگر پروازِ گردونِ نہم سے بھی پرے
اِس طرف سحرِ گمان وظن وتخمیں[۳] ہے دِگر

عقلِ کامل تُو ہے پہنائے دوعالم کی امیں
سوزِ آدم، نُورِ افرشتہ سمجھا اُس میں مکیں!

---

۱ کشتِ پرویں: پروین کی کھیتی۔ پروین کے متعدد ستارے چونکہ یکجا ہیں۔ لہٰذا اُسے کھیتی سے تشبیہ دی
کشتِ پروین سے شاہینِ بلند پرواز دانہ چگتا ہے۔ مگر دیگر پرند خاک ہی میں چونچ مارتے رہ جاتے ہیں؛
۲ نسرین: ایک سفید رنگ کا نہایت حسین وخوشنما پھول؛ ۳ ظن وتخمین: شک وشبہ اور غیر یقینی اندازہ؛

عشق کے خلوت کدے سے ہم ہوئے ہیں رونما
خاک کو ہم نے عطا کی مثلِ آئینہ جلا
چشمِ دل سے دیکھ تو آدم کی ہمّت کا مقام
ہر دو عالم تھے نہاں، اُن کو نمایاں کر دیا
ہے ہمارے سامنے بازی گہِ شام و سحر
ہم نے خیموں کو کیا ندّی[1] کے ساحل پر بپا
دِل میں اپنے دیرِ عالم کی فنا کے واسطے
ایک آتش تھی، دئے ہیں جس نے خشک و تر جلا
شعلہ ہائے دل ہمارے بن چکے ہیں اب شرر
اور ہوئے ہم صاحبِ ذوق و تمنّا و نظر
عشق ہے اِس دَور میں قیدِ ہوس سے خوار و پست
چھوڑ کر حُسنِ یقیں، انسان ہے اب ظن پرست

---

[1] ندّی کے کنارے جہاں خانہ بربادی کا ہر وقت امکان ہے۔ خدا جانے کس وقت موجِ آب حملہ آور ہو!

بزم پر اس دیو نے خود رزم کو ترجیح دی
سینۂ یاراں میں اُس کی تیغ پاتی ہے نشست

رہزنی کو دے رہا ہے وہ "جہاں بانی" کا نام
خواجہ[1] کے ظلم و ستم سے پا گئی محنت شکست

چنگ و نَے کے نغمے پر رقص کر کے پی رہا
خون سے اپنے عزیزوں کے ہے وہ ساغر بدست

وقت کہتا ہے کہ ہو آئیں میں پیدا انقلاب
پھونک دو دنیا کے جسمِ پیر میں رُوحِ شباب

سطوتِ شاہی گئی اور اس کی یغمائی[2] گئی
تاجِ اسکندر گیا، دارا کی دارائی گئی

کوہکن[3] اب کر رہا ہے قصرِ[4] پرویزی طلب
عیشِ خواجہ لُٹ چکا، محنت کی لالائی[5] گئی

---

[1] خواجہ: سرمایہ دار۔ اس مصرع میں "محنت" سے مراد ہے مزدور۔ [2] یغمائی: لُوٹ مار۔
[3] کوہکن: مراد مزدور۔ [4] قصرِ پرویزی: یعنی شاہی محل۔ [5] لالائی: غلامی

پا چکا یوسف نکل کر قید سے تختِ عزیز
حُسن کے فتنے مٹے، شانِ زلیخائی گئی

جو نہاں پردوں میں تھے، وہ راز ہیں اب آشکار
وہ سخن سازی گئی، وہ بزم آرائی گئی

دیکھ چشمِ غور سے، تُو ہے اگر صاحب نظر
کر رہی ہے زندگی تعمیر دُنیائے دگر

دیکھتا خاکِ کہن میں ہوں مَیں گوہر ہائے جاں
چشمِ ہر ذرّہ ستاروں کی طرح ہے ضوفشاں

مَیں ہر اُس دانے کو جو آسودہ ہے زیرِ زمیں
پا رہا ہوں برق در پا اور برومند و جواں

کوہ[1] کو محسوس کرتا ہوں سبک مَیں مثلِ کاہ
کاہ[2] گویا بن رہا ہے دم بدم کوہِ گراں

---

[1] کوہ: مراد سرمایہ دار اور سرمایہ دارانہ نظام۔ [2] کاہ: مراد غریب و نادار اور مزدور لوگ

چرخ بھی جس کو اٹھا سکتا نہیں، وہ انقلاب
دیکھتا ہوں، کر نہیں سکتا مگر اس دم بیاں

ہے وہی دانا، جو دیکھے گردِ میں نہاں سوار
تار کی لرزش سے پالے رُوحِ نغمہ کا شعار

زندگی جوئے رواں ہے اور رہے گی وہ رواں
یہ مئے کہنہ جواں ہے اور رہے گی بھی جواں

جو رہا ہے اور ہے بے کار، وہ ہو گا فنا
جو نہیں تھا اور ہے درکار، وہ ہو گا عیاں

لذّتِ دیدار سے ہے عشق سر تا پا نظر
حُسن مشتاقِ نمو ہے، رہ نہیں سکتا نہاں

جس زمیں میں اشکِ خوں بوتی رہیں آنکھیں مری
اُس زمیں میں اشک بھی بن جائیں گے لعلِ گراں

تیرہ شب نے مجھ کو بخشا صبحِ روشن کا پیام
شمع نے تجھ کر دیا خورشید سے نُورِ دوام

جمعیّت الاقوام

دردمندانِ جہاں نے وضع کی اک بزمِ نَو
تا مٹا دیں "رزم" کا اقوامِ عالم سے فتور
مَیں سمجھتا ہوں کفن چوروں کا ہے یہ اک گروہ
جو اکٹھّے ہو رہے ہیں بہرِ تقسیمِ قبور!

شوپن ہار و نیٹشا

سَیر کو اِک مُرغ[1] اپنے آشیانے سے اُڑا
شاخِ گُل کا خار[2] اُس کے جسمِ نازک میں چبھا
اُس نے بھیجیں باغِ عالم پر ہزاروں لعنتیں
اپنے اور غیروں کے صدموں پر وہ نوحہ گر ہُوا
لالے کو اُس نے بتایا داغِ خونِ بے گناہ
غنچے کو اُس نے کہا نقشِ بہارِ فتنہ زا
بولا "اِس کہنہ سرا میں حسن کی ہے بنیاد کج
کون سی ہے صبح جو پر تو نہیں ہے شام کا"
رنجِ ہستی میں یہاں تک رویا وہ نغمہ طراز
اُس کی دو آنکھوں سے نغمہ خون ہو کر بہ گیا

[1] مراد شوپن ہار۔ [2] مراد مصائبِ زندگی۔

قلبِ ہُدہُدؔ میں ہُوا پیوست اُس کا سوزِ آہ
چونچ سے اپنی نکالا خار اُس کے جسم کا
اُس سے بولا۔ ”فائدہ اپنا ضرر میں کر تلاش
چیر کر سینہ مثالِ گُل زرِ[2] خالص دِکھا
درد کو درماں بنا لے، ہو اگر تُو خستہ تن
خار کا خُوگر ہو، تا گُلشن بنے تیرا بدن!“

فلسفہ و سیاست

فلسفی کو تُو سیاست دان سے یک جانہ تول
اُس کی آنکھیں کور ہیں، اس کی نہیں ہیں اشکبار
وُہ ہے لاتا قولِ حق پر حجّتِ نا استوار[3]
یہ ہے لاتا قولِ باطل پر دلیلِ پائدار

---

[1] مراد نطشے ۔ [2] گُل کے درمیان جو زرد رنگ کا زیرہ ہوتا ہے اُسے ”زرِگُل“ کہتے ہیں ۔ [3] حجّتِ نا استوار: کمزور اور بودی دلیل ۔

صحبتِ رفتگاں

در عالمِ بالا

ٹالسٹائے

بارکش[1] ہو لشکری ہو یا ہو کوئی دستکار
ہر کوئی تیغ وسناں تانے ہوئے ہے بہرِ ناں

ایک ہے اُس کی نظر میں زشت و خوب اور بست و پو
بندۂ بیگانہ، خوں اپنوں کا کرتا ہے رواں

دارو ئے مستی ہے یکسر مذہب و تاج و وطن
ایک ساغر کے عوض خواجے[2] نے چھینے قلب و جاں

کارل مارکس

رازدانِ جزو و کل اپنے سے نامحرم ہے آج
اور ہوس میں زر کی آدم قاتلِ آدم ہے آج

ٹالسٹائے: روس کا مشہور مصلح جس نے یورپ کی سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی۔

کارل مارکس: جرمنی کا مشہور اسرائیلی ماہر اقتصادیات جس نے سرمایہ داری کے خلاف قلمی جہاد کیا۔ اس کی مشہور کتاب موسوم بہ "سرمایہ" کو مذہب اشتراک کی بائبل تصور کرنا چاہیے۔

[1] بارکش: بوجھ اٹھانے والا مزدور۔ [2] خواجہ: سرمایہ دار

ہیگل

معنیٔ مستور کے ہیں دشت و گلشن ترجماں
اک شجر کا ثمرہ سمجھو حنظل[1] و انگور کو

فطرتِ اضداد نے خود کر دیا ہے محوِ جنگ
خواجہ و مزدور کو، اور آمر و مامور کو

ٹالسٹائے

عقلِ دوروں نے بنایا "برتری" کا فلسفہ
بندۂ مزدور کو دیتی ہے وہ درسِ صفا

مزدک

زار و قیصر کی زمیں سے دانۂ ایراں اُگا
مرگِ نو کے رقص سے معمور ہے قصرِ امیر

آتشِ نمرود میں برسوں ہی جلتا ہے خلیل
تا کہ دھو دے کعبے سے نقشِ خداوندانِ پیر

دورِ پرویزی گیا، اے بندۂ پرویز اُٹھ!
اپنا حق لے شاہ کو کر دام میں اُس کے اسیر

کوہکن[2]

میرا دلبر[3] بھولا بھالا اور کم آمیز ہے
جنگ آرا ہے، ستم گر ہے، فساد انگیز ہے

[1] حنظل: اندرائن کا پھل جو نہایت تلخ ہوتا ہے۔ [2] یہاں کوہکن سے مراد ہے مزدور [3] مراد سرمایہ دار۔

بزم کا مفتوں بظاہر۔ در حقیقت رزم دوست
گو زباں عیسیٰؑ کی ہے، دل پیروِ چنگیز ہے!
عقلِ وحشت خیز آنکھوں سے رواں ہے جوئے خوں
جلوہ گر ہو۔ جان میری شوق سے لبریز ہے
ریزہ ریزہ گو مرے تیشے سے ہیں کہسار بھی
گردشِ گردوں ابھی تک حامیٔ پرویز[1] ہے
خاک سے تا آسماں سب کچھ ہے سرگرمِ سفر
تیز پا ہو، کیونکہ پائے کارواں بھی تیز ہے

نٹشا

سستیٔ انساں پہ دل نٹشے کا تھا اندوہناک
فکر نے اُس کی بنایا جسم اک مضبوط تر[2]
توبہ توُ فتنے کئے اس نے بپا افرنگ میں
ہاتھ دیوانے کے آئی کارگاہِ شیشہ گر

[1] مراد سرمایہ دار۔ [2] "مضبوط تر جسم" سے مراد ہے "فوق الانسان" جس کی صفات عالیہ کا تذکرہ نٹشے نے اپنی کتاب "بقول زردشت" میں جا بجا کیا ہے۔

حکیم آئن سٹائن

مثلِ موسیٰؑ بہرِ جلوہ تھا وہ دائم ناصبور
آخر اُس کے قلب نے ظاہر کئے اسرارِ نُور
آسماں سے چشمِ آدم تک ہو راہِ یک نفس!
برق رفتاری کو اُس کی پا نہیں سکتا شعور
خلوت اُس کی کان میں ہے کوٹلوں کی رازدار
جلوت اُس کی پھونک دیتی ہے شجر بالائے طور
دائمی اُس کا اُصولِ چون و چند و بیش و کم
برتر از پست و بلند و دیر و زد و نزد و دُور
اُس کی فطرت میں نہاں ہے سوز و سازِ مرگ و زیست
سوز سے اُس کے ہے شیطاں، ساز سے جبریل و حُور

اُس حکیمِ نکتہ رس کا مَیں بتاؤں کیا مقام
نسلِ[1] موسیٰؑ سے کیا زردشت نے گویا ظہور!

بائرن

لالہ و گُل کی طرح شعلے اُٹھیں گے خاک سے
قطرہ ہائے مے جو گلشن میں گرائے اُس کا جام
اُس کی طینت کے لئے موزوں نہ تھی بادِ[2] فرنگ
برق تھا پیکِ محبت کے لئے اُس کا پیام
کیا پری خانے بنائے اُس کے رنگِ شعر نے
ہے پیامِ بیخودی اُس کی تجلّی گاہِ بام
طائرِ معنی ہُوا اپنے نشیمن[3] سے نفور
سازگار اُس کی طبیعت کے لئے گویا تھا دام

---

[1] حکیم آئن سٹائن بنی اسرائیل میں سے ہے ؛ [2] اس مصرع میں بائرن کی جلاوطنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ؛ [3] نشیمن سے مراد ہے انگلستان جو بائرن کا اصل وطن تھا۔ بعد ازآں سیاسی محرکات کے تحت اُسے جلاوطن ہو کر اٹلی (روم) جانا پڑا ؛

نیٹشا

نغمۂ فطرت جو سُننا ہو تو اُس سے کر گریز
اُس کے خلے میں نہاں ہے ایک برقِ تند و تیز
اُس نے گھونپے ہیں دلِ مغرب میں نشتر پے بہ پے
اور چلیپا کے لہو سے ہاتھ اُس کا سُرخ ہے
اُس نے بُت خانہ بنا ڈالا بہ اندازِ حرم[۱]
اُس کا دل مومن ہے سر میں ہیں بھرے لیکن صنم

خود کو اُس نمرود کی آتش میں اے مومن جلا[۲]
باغ ابراہیمؑ کا بھی آگ سے پیدا ہُوا

---

[۱] حرم کے انداز پر بُت خانہ بنانے کے یہ معنی ہیں کہ نیٹشا نے انسان کو خودی اور عرفانِ نفس کی تعلیم تو دی، لیکن صاحبِ خودی یعنی فوق الانسان کے عشق میں اتنا مستغرق ہُوا کہ نتیجہ کار خدا کا بھی منکر ہو گیا۔

[۲] یعنی نیٹشا کے فلسفۂ حیات سے استفادہ تو کر، لیکن دہریت کے عناصر کو سراسر نظر انداز کر دے۔ خُذ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ۔ "مفید و پاک شے تو قبول کر لے مگر مضر و ناپاک چیزیں چھوڑ دے"۔

جلال و ہیگل

میں کرتا تھا تلاشِ سوز و سازِ فکرِ المانی
کہ اس کی برقِ حکمت نے جلا دی کسوتِ آنی[۱]

خیال اُس کا دو عالم کے حقائق پر ہُوا حاوی
خجل ہے اُس کی حکمت سے فلک کی تنگ دامانی

تصوّر اُس کی گہرائی کو ہرگز پا نہیں سکتا
سفینہ عقل کا دریائے ہیگل میں ہے طوفانی

یکایک نیند نے میرے عناصر پر کیا جادو
مری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے سب باقی و فانی

نقابِ خواب میں دل بھر گیا میرا تجلّی سے
تجلّی میں نظر کے سامنے تھا پیرِ یزدانی

جلال الدین رومیؒ آفتابِ چرخِ لاہوتی
ہوئے جس کی ضیا پاشی سے روم و شام نُورانی

جہاں کی ظلمتِ باطل میں اُس کا قلبِ حق آگاہ
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

کلام اُس کا بہارِ جاوداں حُسنِ معانی کی
نکو اندیش و عقدت خیز جس سے فکرِ انسانی

لگا کہنے کہ خوابِ ہوش سے بیدار ہو غافل
سرابِ عقل میں کشتی کو تُو کرتا ہے طوفانی!

۱ کسوتِ آنی: فانی اور بوسیدہ چیزوں کا لباس۔

خرد سے پا نہیں سکتا کبھی تو عشق کی منزل[1]
کرے گا کیا چراغِ راہ سے خورشید کو حاصل؟

پٹوفی[2]

بوستانِ دہر میں جب تو ہُوا نغمہ سرا
بُلبُل و گُل تیرے نغموں سے ہوئے رنگیں نوا
ایک کا غم کم ہُوا تو دُوسرے کا تھا فزوں
شعر سے تیرے نمایاں ہے ترا سوزِ دروں
خون سے تیرے عروسِ لالہ میں رنگِ وجود
تیری آہِ صبح سے غنچے کے دل کی ہے کشود
کیا ہُوا تیرا اگر ہے جسم محرومِ مزار
شعر تیرا ہے تری اک غیر فانی یادگار
جب زمیں ہی سے نہ تھا، جاتا تو کیوں زیرِ زمیں
خاک کا گہوارہ تیرے جسم کے قابل نہیں!

---

[1] یعنی عقل کبھی مقامِ عشق تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی؛
[2] ہنگری کا جوانا مرگ شاعر جو حمایتِ وطن میں جنگ کرتا ہُوا مارا گیا۔ مگر اُس کی لاش دستیاب نہ ہوئی کہ کوئی یادگارِ خاکی اُس پر استوار کی جاتی؛

گفتگو مابین حکیم اسٹیٹس کو مسٹ و مردِ مزدور

حکیم

ہیں سبھی انسان اے نادان عضوِ یک دگر — نخل ہے وہ ایک ہی جس کے ہیں یہ سب برگ و بر
سر میں آئینِ خرد فطرت کی گُل کاری سے ہے — پائے انساں خاک پر فطرت کی طراری سے ہے
صانعِ عالم نے کر دی قسمتِ[1] میر و فقیر — آمر و مامور[2] ہیں قانونِ قدرت کے اسیر
ایک اگر ہے کار فرما[3]، ایک ہوگا کارساز[4] — ہو نہیں سکتا کبھی محمود سے کارِ ایاز!

روزِ اوّل سے ہوئی تقسیم کارِ زندگی
اور اِس تقسیم سے گُلشن ہے خارِ زندگی

مردِ مزدور

تُو نے حکمت سے مجھے دھوکا دیا ہے اے حکیم — دانشِ فرعون گر[5] کا ہے یہ اک سحرِ قدیم
ہیچ کارہ مس[6] کو تُو نے زر سے صیقل کر دیا — اور سکھاتا ہے مجھے پھر خوئے تسلیم و رضا
بحرِ طوفاں خیز میری آبنا میں ہے اسیر — میرا تیشہ سنگ سے کرتا ہے جاری جوئے شیر

---

۱ قسمت: یعنی تقسیم ۔ ۲ آمر و مامور: حاکم اور محکوم ۔ ۳ کار فرما: حکم دینے والا اعلیٰ افسر
۴ کارساز: کام کے فرائض انجام دینے والا، دستکار ۔ ۵ دانشِ فرعون گر: سرمایہ دار اور مستبد بادشاہ بنانے والی عقل ۔ ۶ مس: تانبا ۔

کوہکن[1] کا حق عطا کرتا ہے تو پرویز[2] کو
عادل و ہمدرد ٹھہراتا ہے یوں چنگیز کو؟

خون جاری کرتی ہے محنت پسینے کی جگہ
خواجہ نائے[3] و نوش میں ہوتا ہے اس دم شادماں

مت بنا تو ہر خطا کو سحرِ حکمت سے ثواب
کر نہیں سکتا مقید خضر کو دامِ سراب

الاماں! دوشِ زمیں کا بار ہے سرمایہ دار
عیشِ خواب و خور ہی میں وہ غرق ہے لیل و نہار

ہے فروغ و رونقِ عالم کا باعث دستِ مزد
اور ہے کذب و فریب و ظلم میں مصروف دزد[4]

جرم کو اس کے چھپایا تو نے عذرِ لنگ سے
ہیں ابھی پرزے بہت کمزور تیری عقل کے

ہیگل

حکمتِ معقول[5] اس کی دور ہے محسوس سے
گو حسیں پیراہن اس کی فکر ہے مثلِ عروس
طائر اس کی عقل کا کیا ہے؟ وہ ہے اک ماکیاں[6]
زورِ مستی سے جو انڈے دے رہی ہے بے خروس[7]

۱ کوہکن: مراد مزدور؛ ۲ پرویز: فریبی اور غاصب و مکار سرمایہ دار؛ ۳ نائے و نوش: موسیقی اور شراب نوشی؛ ۴ دزد: چور، مراد غاصب سرمایہ دار؛ ۵ حکمتِ معقول: وہ فلسفہ جو محض عقلی دلائل و نظریات پر مبنی ہو؛ ۶ ماکیاں: مرغی؛ ۷ خروس: مرغ؛

جلالؔ و گوئٹے

ایک دن جنت میں گیتے پیرِ رُومیؔ سے مِلا
نُورِ فطرت سے منوّر قلب اُس کا ہو گیا

مثلِ رومیؔ گو نہیں وہ شعر میں عالی جناب
جو پیمبر بھی نہیں لیکن ہے دارائے کتاب

شوق سے بیٹھا وہ پیشِ محرمِ سرِّ قدیم
اور سُنایا قصّۂ پیمانِ ابلیس و حکیم[1]

بولا رُومی اے کہ تجھ پر رُوحِ شعری ہوشیار
ہے تری حکمت فرشتہ گیر اور یزداں شکار

فکر تیری اک زمانہ دل میں رہی تیرے نہاں
اِس جہانِ کہنہ کو پھر اُس نے کر ڈالا عیاں

جسمِ ہر ذرّہ میں دیکھا سوزِ تُو نے رُوح کا
اور گوہر کا صدف میں تو نے دیکھا ارتقاء

عشق کے رازِ دل کو ہر انسان پا سکتا نہیں
عشق کے دربار میں ہر شخص آ سکتا نہیں

---

[1] اِس قصّے سے مراد ہے گوئٹے کا مشہور و معروف ڈراما "فوسٹ"۔ اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کو قدیم روایات کی روشنی میں بیان کرتے ہوئے انسان کے روحانی و عملی ارتقاء کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمالِ فن تصوّر میں نہیں آسکتا۔

جس کو حق نے کر دیا ہے محرمِ رازِ ازل
سُن رہا ہے وہ صدائے نغمۂ سازِ ازل

زیرکی[1] تخلیقِ نادر جادوئے شیطاں کی ہے
عشق اک ایجادِ زندہ حکمتِ انساں کی ہے

پیغامِ برگساں

تا تجھ پہ آشکار ہوں اسرارِ زندگی
دِل کو جُدا تُو شعلے[2] سے مثلِ شرر نہ کر
فطرت کو دیکھنا ہو تو نظروں کو دے جلا
اپنے جہاں میں مثلِ غریباں[3] گزر نہ کر
تیرا تو جو بھی نقش ہے، وہم و خیال ہے
لا ایسی عقل عشق کا جس میں جلال ہے

۱؎ زیرکی: عقل و خرد۔ ۲؎ شعلہ: مراد سوزِ عشق۔ ۳؎ غریباں: جمع غریب بمعنی مسافر۔

میخانۂ فرنگ

وہ بھی کیا دِن تھے کہ مَیں تھا رونقِ بزمِ فرنگ
آئینے سے بھی جلی ہے اُس کے میخانے کا جام

مے کا سرچشمہ تھی چشمِ مے فروشاں کی نظر
اُس کے ساقی کی نگاہیں بے خودی کا تھیں پیام

طور اُس کا بے کلیمؑ اور شعلہ اُس کا بے خلیلؑ
عقلِ ناپروا ہے رُوحِ عشق کی مرگِ دوام

رند اُس کے بے خبر ہیں لغزشِ مستانہ[1] سے
اور ہُوا یکسر ہے خالی آہِ بے تابانہ سے

---

[1] لغزشِ مستانہ: عشق کی جراتِ رندانہ جو صرفِ عشقِ حق اور عرفانِ نفس سے پیدا ہوتی ہے۔

موسیولینن و قیصر ولیم

موسیو لینن

اِس سرائے کہنہ میں صدیوں سے انسانِ جہول
مثلِ دانہ پس رہا ہے زیرِ سنگِ آسیا[1]
اقتدارِ زار و قیصر کے کبھی کھائے فریب
حلقۂ دامِ کلیسا کا کبھی قیدی رہا
فاقہ کش بندے نے آخر پارہ پارہ کر دیا
جامۂ خواجہ جو اُس کے خُون سے رنگین تھا
پُھونک ڈالا آتشِ جمہور نے کہنہ جہاں
ہو کلیسا یا ہو شاہی سب پہ طاری ہے خزاں

---

[1] آسیا: چکّی۔ یعنی سادہ لوح مزدور اپنی حماقت سے سرمایہ داری کی چکّی میں مثلِ دانہ پستا چلا آیا ہے۔

قیصر ولیم

بُت کدے میں عشوہ و نازِ بتاں کا کیا قصور
ہے طواف و سجدہ کی عادی سرشتِ برہمن

روز و شب وہ خود بناتا ہے خداوندانِ نَو
کیونکہ چھُٹتے ہی نہیں دل میں خُدایانِ کُہن

کیا سُناتا ہے مجھے تو رہزنوں کا ظلم و جور
اپنے ساماں کے لئے رہرو ہے خود ہی اہرمن

ہو سرِ جمہور پر بھی گر کبھی تاجِ شہی
فتنہ و ہنگامہ سے معمور ہو گی انجمن

بندۂ خواہش کے دل سے مر نہیں سکتی ہوس
عیش کے شعلے بپا کرتی رہے گی مرزغن[1]

چل رہا ہے عقل پر سحرِ عروسِ اقتدار
قید رکھے گی دلوں کو اُس کی زلفِ پُرشکن

نازِ شیریں کے جہاں میں ہیں ہزاروں قدرداں
اُس کو خسرو[2] نے جو چھوڑا، آئے گا خود کوہکن[3]

۱؎ مرزغن : آتشدان ۔ ۲؎ خسرو : سرمایہ دار ۔ ۳؎ کوہکن : مراد مزدور

حکما

لاک

بادۂ خورشید سے ہے جام میں اُس کے ضیا
محفلِ گُل ہیں تہی تھا ورنہ ساغر لالے کا!

کانٹ

اُس نے ذوقِ بادۂ آئینہ صورت پایا تھا
جام کا کوکب شبستانِ ازل سے لایا تھا

برگساں

مے ازل سے وہ نہ لایا اور نہ لایا کوئی جام
اُس کا لالہ داغِ دل سے پا گیا سوزِ دوام

---

[1] کوکب: ستارہ۔ جامِ مے کو "کوکب" کہنا حسنِ تشبیہ کی انتہا ہے؛

شعرا

برونگ

بادۂ سرجوشِ ہستی تھا ابھی کچھ خام سا
خضرؑ سے کچھ آب لے کر ڈال دوں گا جام میں

بائرن

خضرؑ کے احسان سے سینہ کروں کیوں داغ داغ
مَیں جگر سے آب لے کر ڈال دوں گا جام میں

غالب

تلخ تر ہو جائے بادہ اور سینہ ریش تر[1]
آبگینے کو گلا کر ڈال دوں گا جام میں

رُومی

بادۂ خالص کہاں، آمیزشِ صنعت کہاں
تاک[2] سے مَیں بادہ لے کر ڈال دوں گا جام میں

---

[1] ریش تر : زیادہ زخمی ۔ [2] تاک : انگور کی بیل ۔

خراباتِ فرنگ

شب کو دیکھا جو تماشائے خراباتِ فرنگ
بخشا اک رند کی باتوں نے مجھے کیفِ صعود[1]
وہ یہ بولا کہ کلیسا نہ سمجھ تو اُس کو
جس میں ہے دخترکِ زہرہ وش و نائے و سرود
اِس خراباتِ فرنگی کے سرورِ مے سے
جو ہے مذموم، نظر آتا ہے فعلِ محمود
نیک و بد تولنے کی اور ترازو ہے یہاں
نفس کا شوق ہے معیارِ نصاریٰ و یہود
خوب[2] ہے زشت اگر پنجہ ہو تیرا کمزور
زشت ہے خوب اگر زور ہو حسبِ مقصود

[1] صعود: رُوحانی پرواز ؛ [2] خوب: خوبصورت ؛ [3] زشت: بدصورت

تُو اگر غور کرے درسِ ریا ہے ہستی
پیروِ صدق کا مٹ جانا ہے دُنیا سے وجود
دعوئ صدق و صفا پردۂ تلبیس و ریا
ہے روا اُس کو یہاں جوہرِ سیمیں کی نمود

مَیں نے کہہ ڈالے ہیں اسرارِ نہانخانۂ زیست
تو انھیں دل ہی میں رکھ، تاکہ ہو حاصل مقصود

~~~~~~~~~~

خطاب بہ انگلستان

اہلِ مشرق نے جو پی لی ہے شرابِ افرنگ کی
کیا عجب سب نے جو توبہ کی صراحی توڑ دی
~~~~~~~~~~

پختہ تر اُس نے کیا جب شیوۂ تدبیر میں
خون کھول اُٹھا وجودِ بندۂ تقدیر میں
شورشِ مستاں سے اے ساقی نہ ہو توسیخ پا[1]
تُو ہی کہہ ہنگامۂ عالم بپا کس نے کیا؟

بُوئے گُل خود ہی بنی اُس کی چمن کو راہبر
ورنہ بلبل کو کہاں تھی بزمِ گلشن کی خبر

سرمایہ دار اور مزدُور
(تقسیمِ حقوق کی شاطرانہ منطق)

تقدیر میں میری ہے مشینوں ہی کا غوغا
اور وجہِ سکوں تیرے لئے بانگِ کلیسا

[1] سیخ پا : غضبناک ؎

میرے لئے وہ باغ، لگا جس پہ ہے محصول
اور تیرے لئے خاص ہوئی جنّتِ ماویٰ
میرے لئے تلخابہ کہ ہو دردِ سر اس سے
اور تیرے لئے جنّتِ فردوس کی صہبا
ہے میرے نصیبوں میں تذرد اور کبوتر
اور تیرے لئے ظلِّ ہما[1]، شہپرِ عنقا

میرے لئے یہ خاک اور اس کی سبھی تخلیق
جاگیر تری خاک سے تا عرشِ معلّا

---

[1] ظلِّ ہما: ہما کا سایہ، ہما اور عنقا ہر دو خیالی اور فرضی پرندے ہیں۔

نوائے مزدور

مرگیا دم توڑ کر گو بندۂ کرپاس[1] پوش
خواجۂ ناداں کے تن پر ہے مگر رختِ حریر[2]

خاتمِ والی[3] کا نگ ہے قطرۂ خونِ غلام
اشکِ کودک سے ہے اُس کے زینتِ تاجِ امیر

بندۂ مزدور کی محنت سے مذہب کی بقا
نور سے اُس کے ہوئی بزمِ سیاست مستنیر!

دشت کو گلشن کرے مزدور کا اشکِ سحر
لالہ و گُل میں کرے شعلے بپا اُس کا جگر

تازہ تر نغمے سُناتا ہے ہمیں اب سازِ وقت
آ کہ ساغر میں اُلٹ دیں اک مئے والا گہر

۱؎ کرپاس پوش : ٹاٹ پہننے والا مزدور ؛ ۲؎ رختِ حریر : ریشمی لباس ؛
۳؎ خاتمِ والی : آقا کی انگشتری ؛

آ، نظامِ تازہ دیں اِس دَور کے رندوں کو ہم
اُٹھ، پُرانے میکدوں کو اب کریں زیر و زبر
اِس چمن کے رہزنوں سے انتقامِ لالہ لیں
گلستاں کے واسطے تجویز ہو طرحِ دگر[1]
شمع کی حُب میں فنا تُو مثلِ پروانہ نہ ہو
اپنی ہی عظمت سے اے نادان بیگانہ نہ ہو

آزادیٔ بحر

ایک بطخ بولی سمندر آج سے آزاد ہے
ہر کس و ناکس کو پہنچا ہے یہ فرمانِ خضر
"جا جہاں بھی چاہیے" بولا اُسن کر یہ اُس سے نہنگ
مجھ سے لیکن ایک لمحے کو بھی مت رہ بے خبر!

[1] طرح دگر: نئی بنیاد، نیا آئین و دستور۔

خضر

(اشعارِ متفرّقہ)

جسم کا ہر ذرّہ گویا کھا رہا ہے پیچ و تاب
میرے ہر دم میں نہاں ہے محشرِ درد و اثر
ایک دن ظلمات میں بولا سکندر سے خضرؑ
مرگ ہے دشوار، لیکن زندگی دُشوار تر

دُرِ دانہ بحر کا ہے ازل سے اداشناس
چکّی کی گردشوں کا اُسے علم ہی کہاں

ہے تہی مغزی سے، خامے میں ہے جتنی بھی نفیر[1]
جو قلم سرمے کا ہے اُس میں نہیں کوئی صریر[2]

~~~~~~~~

بُت بغل میں داب کر میں نے کیا طوفِ حرم
پیشِ بُت میں نے لگایا نعرۂ اللہ ہُو
دل میں اب بھی آرزو و جستجو کا ذوق ہے
چل رہا ہوں راہ پر باریک ہے جو مثلِ مُو

~~~~~~~~

گُل چمن میں بول اُٹھا خوب ہے عیشِ بہار
ساری دُنیا سے ہے بہتر صبحِ گلشن کا نکھار
قبل اس سے تو کسی کی زینتِ دستار ہو
ہے یہی بہتر کہ مرجائے کنارِ شاخسار

[1] نفیر: آواز۔ [2] صریر: قلم کے چلنے کی آواز۔

گفتگو کر سکتے ہیں سب طفلک و برنا[1] و پیر
گفتگو کے واسطے مہمل ہے قید ماہ و سال[2]

تین چیزیں ہیں بصارت کے لئے بے حد مفید
اور وہ ہیں سبزہ و آبِ رواں و روئے خوش[3]
تین چیزیں جسم میں کرتی ہیں پیدا فربہی
اور وہ ہیں جامۂ قز[4]، جانِ بے غم، بوئے خوش

میں بتاتا ہوں تجھے رازِ حیاتِ جاوداں
خواب ہے مرگِ سبک، اور مرگ ہے خوابِ گراں

[1] برنا: مردِ جوان۔ [2] یعنی معقول و صحیح گفتگو کے لئے کہنہ سالی کی شرط بے معنی ہے۔ اگر تربیت اچھی ہو تو ایک بچہ بھی سلجھی ہوئی گفتگو کر سکتا ہے ؛ [3] روئے خوش: حسین و جمیل چہرہ۔
[4] جامۂ قز: ریشمی لباس ؛

عفو کا نابود اگر ہے حوصلا
برملا دشمن سے ہے جنگ آزما
سینے کو مت مرکزِ کینہ بنا
یوں نہ اپنے شہد میں سرکہ ملا

طبعِ شاعر کی نزاکت کا نہ پوچھو ماجرا
اُس کا شیشہ توڑ دیتی ہے فقط موجِ ہوا
کیا بیاں ہو اُس سے شرحِ کارزارِ[۱] زندگی
رنگ جس کا فق ہو، جب دریا میں ٹوٹے بُلبلا

رزمگاہِ زیست میں مانندِ جوئے کوہسار　　اونچ نیچ اور پیچ و خم سے راہ کے آگاہ ہو
یا اگر چلنا ہے، مثلِ سیلِ بے زنہار چل　　بے نیازِ بندشِ پست و بلندِ راہ ہو

۱ کارزارِ زندگی : زندگی کا میدانِ جنگ - اِس میدانِ جنگ میں شاعروں کا وہ گروہ کیا دادِ شجاعت و مردانگی دے گا جس کی ناتوانی کا یہ عالم ہو : ؂
چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ　　ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

گُل[1] چُنے ہیں تُو نے تو اب خار[2] سے نالاں نہ ہو
خار بھی بادِ بہاری سے ہوئے ہیں آشکار

~~~~~~~~~~

ریش و ابرو اور سر پر مت لگا ہر دم خضاب
سال و مہ کو تو چُرا کر ہو نہیں سکتا جواں

~~~~~~~~~~

دُوں ہمّتوں سے عشق کو نفرت رہی سدا
شاہیں تذرو[3]ِ مردہ کو کرتا نہیں شکار

~~~~~~~~~~

جنسِ شاعر در خورِ بازار ہو سکتی نہیں
کون سیمِ نسترن[4] کے بدلے دے سکتا ہے نان؟

۱؎ گُل: مراد راحت و آرام، خوشحالی ؛ ۲؎ خار: مراد مصائب و حوادث ؛
۳؎ تذرو: ایک نہایت خوش رنگ مُرغِ صحرائی ؛ ۴؎ سیمِ نسترن: نسترن کی چاندی نسترن ایک سفید رنگ کا پھُول ہے، لہٰذا اسے چاندی سے تشبیہ دی ؛
~~~~~~~~~~

پیروِ اسلام اگر ہوتا یقیں سے بہرہ ور
دہر میں کرتا نہ ہرگز اتباعِ وہم و ظن
بہرِ اخلاق و عمل "تقلید"[1] اگر ہوتی مفید
تو پیمبر بھی رہِ آبا پہ ہوتا گام زن!

[1] تقلید: صحیح و غلط، جائز و ناجائز اور حق و باطل کی تحقیق کئے بغیر محض حسنِ عقیدت کے جوش میں آنکھیں بند کر کے کسی کی پیروی کئے جانا۔